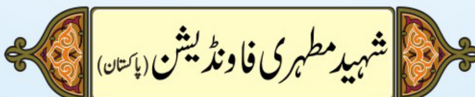


29

انقلابِ اسلامی کی فکری بنیادیں





www.shaheedmutahhari.com

انقلاب اسلامی

کی فکری بنیادیں

آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ

مترجم

پروفیسر مفخر عالم

ناشر

شہید مطہری فاونڈیشن لاہور پاکستان

نام کتاب	انقلاب اسلامی کی فکری بنیادیں
مصنف	آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجم	پروفیسر مفخر عالم
کمپوزنگ	انس کمیونیکیشن لاہور 0300-4271066
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن
زیرِ اہتمام	ابوظہیر
سال اشاعت	2014

ملنے کا پتہ:

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0321-4971214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

0333-5234311

عنوانات

عَرضِ ناشر

اللہ رب العزت کے نام سے ابتدا ہے جو ہمارا مالک وخالق ہے اور درود ہے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل پر جو ہمارے لئے رہبر و رہنما اور باعث رحمت ونجات ہیں۔

شہید مطہری فاونڈیشن کا قیام عمل میں لانے کا مقصد اس صدی کے عظیم مفکر اور فلسفی جناب شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ کے علمی آثار کو اشاعت کے ذریعے محفوظ بنانا ہے۔ بلا شبہ اگر اس صدی میں کسی مفکر اور انقلابی کا تذکرہ کیا جائے تو ان چند افراد میں جناب استاد شہید کا نامِ نامی سرفہرست ہوگا۔

اس کتاب کا مطالعہ آپ کی روح کو تازگی اور نشاط عطا کرے گا۔ کتاب کے متعلق مترجم نے بہت کی سیر حاصل تعارف پیش کیا ہے اس لئے میں کتاب کے حوالے سے کوئی بات نہیں کروں گا صرف ایک گذارش ہے کہ اگر آپ کے پاس استاد شہید کی کوئی کتاب موجود ہے تو از راہ کرم یہ ہمیں ارسال فرمادیں تا کہ اس کی اشاعت کا بندوبست کیا جا سکے اس طرح آپ استاد شہید کے علمی آثار کو جمع کرنے میں آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوجائیں۔ یہ ہم پر فرض بھی ہے اور قرض بھی۔

ادارہ

عرضِ مترجم

....اور طلسم ٹوٹ گیا!

انقلاب اسلامی ایران بلاشبہ اس دور کا سب سے بڑا معجزہ ہے جس کے ظہور سے سپر طاقتوں کے ایوان کانپنے لگے ہیں اور سامراجی ممالک کے سربراہوں کی راتیں بے خواب ہوگئی ہیں۔ صدر امریکہ نے اس انقلاب کو اپنی جھولی میں ڈالنے کے لئے بیان دیا کہ امریکی اور اسلامی ثقافت میں بڑی گہری مماثلت ہے نیز پہلی بار امریکہ کی جانب سے اہل اسلام کو عید کی مبارکباد بھی پیش کی گئی۔ صدر امریکہ نے اپنے عملے کو ہدایت جاری کی کہ اسلام کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ اسے پیش کی جائے۔

بہرحال جہاں یہ اسلامی انقلاب پوری دنیا پر اثر انداز ہوا وہاں اس نے عالم اسلام میں انڈونیشیا سے لے کر سینی گال تک مسلمانوں کو ایک جذبۂ تازہ دیا۔ انہیں سید جمال الدین افغانیؒ اور علامہ اقبال کا احیائے اسلام کا خواب زندہ حقیقت کا روپ دھارتا نظر آنے لگا۔ مغربی افکار کی مرعوبیت کا طلسم ٹوٹنے لگا اور اپنے اسلامی ورثے پر شرمندگی کی بجائے اظہار فخر کی جرأت ہونے لگی۔ اسلامی ممالک میں غیر اسلامی تہذیب و اقدار کے خاتمے اور اسلامی نظام کو اپنانے کی تحریک پیدا ہوگئی۔

اسلام دشمن عناصر سامراجی طاقتوں اور اسرائیل اور جنوبی افریقہ کے حامیوں

نے اپنے مفادات خطرے میں دیکھ کر اس انقلاب کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک زبردست محاذ کھڑا کر دیا۔ انقلاب کو ناکام کرنے کے لئے بڑی بڑی سازشیں تیار کی گئیں حتیٰ کہ اسلامی انقلاب کی فکری بنیادوں کو منہدم کرنے کے لئے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے فکری انتشار پیدا کرنے، اسے اصلی راستے سے ہٹانے اور اس میں بیرونی ازموں کے افکار کا پیوند لگانے کی کوششیں بھی کی گئیں مگر الحمد اللہ کہ اسلام پر حق الیقین رکھنے والے انقلابی قائدین اور مفکرین نے بروقت اسلامی انقلاب کی فکری وضاحت کر کے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اب عوام نے رہبر عظیم امام خمینی مدظلہ العالی کی بلند قیادت اور انقلاب کی اسلامی حقیقت پر یقین رکھتے ہوئے اسے انتہائی مستحکم کر دیا ہے یوں یہ انقلاب نعمتیں اور رحمتیں برساتا ہوا اپنے اصلی راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔

زیر نظر مقالات عظیم اسلامی مفکر استاد شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہری نے انقلاب کی کامیابی کے بعد پیش کیے تھے۔ یہ مقالات آپ کی زندگی کے ان آخری مقالات میں سے ہیں جو آپ کی شہادت کے بعد جمع کئے گئے کیونکہ آپ کو انقلاب کی کامیابی کے بعد سوا سال کے اندر اندر مخالفین اسلام نے شہید کر دیا، آپ نے اپنی ان ہمہ گیر مصروفیات کے باوجود جو اس ہنگامی دور میں انقلابی اور عدالتی کمیٹیوں کی سربراہی کی بنا پر آپ کے کاندھوں پر تھیں ان تقاریر و مقالات کے ذریعے انقلاب اسلامی کے مستقبل کی وضاحت کی، آئندہ کے خطرات سے خبردار کیا اور اس کی آئندہ حکمت عملی کی فکری بنیادیں فراہم کیں اور لوگوں کو اسلام اور اسلامی انقلاب کی حقیقت و ماہیت سے روشناس کرایا۔

ان مقالات میں آپ نے انقلاب کے دوام اور تسلسل کے لئے بنیادی ارکان وعوامل کی نشاندہی کی ہے تاکہ عوام اپنے اس اسلامی انقلاب کو مضبوط کرنے اور انقلاب کو انحراف کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کو پیش نظر رکھیں۔ ان میں آپ نے مندرجہ ذیل نکات کو روشن کیا ہے:۔

آزادی فکر اور آزادی نظریہ

آزادی فکر اور آزادی سازش میں فرق
حقیقی اور غیر حقیقی انقلابات میں فرق
اسلامی انقلاب کی حقیقت
انقلاب برپا کرنے والے عوامل
انقلاب کو قائم رکھنے والے عوامل
عدل اجتماعی
تہذیبی آزادی اور ثقافتی استقلال
انقلاب میں معنویت وروحانیت
امام خمینی کی اسلامی سربراہی کی کامیابی کا راز

ہمیں امید ہے کہ زیر نظر مقالات کا ترجمہ اسلامی انقلاب کو سمجھنے میں اہل نظر کی مدد کرے گا۔ ہمارا ملجاؤ ماویٰ توحید ہے ہماری منزل اسلام ہے ملت کے قافلے کو اس منزل تک پہنچانے کے لئے بہت سے عظیم افراد نے اپنی فکر اور لہو کے چراغ روشن کئے ہیں۔ ہم بھی اسی راہ پر گامزن ہیں۔

ومن المئومنين رجال صدقوا ماعاهدوا الله عليه فمنهم من قضیٰ نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا۔

ان مومن لوگوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا، اسے سچا کر دکھایا پس ان میں سے کچھ نے اپنا عہد پورا کرتے ہوئے موت کو آغوش میں لے لیا اور باقی منتظر ہیں اور انہوں نے ہرگز اپنے عہد میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں کی۔

طالب عظمت اسلام
شاہ مفخر عالم
۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۳ ہجری

آزادیٔ فکر

الٰہیات کالج، تہران میں ۱۲ اسفند ۵۷ کی تقریر

سب سے پہلے میں یہ وضاحت کر دوں کہ ان دنوں خصوصاً ان آخری چند دنوں میں میں اس قدر مصروف رہا کہ اس کالج کے لئے ایک تقریر تیار کرنے اور ترتیب دینے کی فرصت ہی نہ ملی جبکہ میرا اس کالج سے خاص تعلق رہا ہے۔[1] البتہ دو نکتے میرے پیش نظر رہے ایک تو مقام تقریر کی نسبت سے کیونکہ یہ الٰہیات اور علوم اسلامیہ کا کالج ہے اس لئے بہرحال یہ دیکھنا چاہئے کہ بحیثیت مجموعی، یونیورسٹی میں یہ کونسے پیغام کا حامل ہو اور خاص طور سے اس مقدس اسلامی تحریک کے لئے اس کا کیا پیغام ہونا چاہئے اور دوسرا موضوع جو کہ موضوع اول ہی سے مربوط ہے وہ نظریئے کی آزادی کا مسئلہ ہے جو کہ آج کل ہماری یونیورسٹی میں شدت سے اٹھایا گیا ہے۔

لیکن موضوع اول یعنی وہ پیغام جو یہ کالج بحیثیت مجموعی یا بطور خاص منتخب کر سکتا ہے زیادہ تر اسلامی آئیڈیالوجی کے دفاع اور اس کی تفسیر و توجیہ سے متعلق ہے۔

ماضی میں اس کالج نے ایسی پیغام بری انجام دی ہے یا نہیں اور اگر انجام دی

[1] آیت مرتضیٰ مطہری، تہران یونیورسٹی کے اس کالج میں ایک عرصے سے استاد رہے تھے۔مترجم

ہے تو کس قدر اور اگر نہیں انجام دی تو اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ یہ امور اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہیں۔ کم از کم اس گفتگو میں ہمیں ماضی سے سروکار نہیں۔ ہمارے پیش نظر یہ ہے کہ آئندہ اس کالج کو کس پیغام کا حامل ہونا چاہئے؟ جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا ہے اور خود بھی غور کرتا رہا ہوں کہ اس کالج کو اسلامی آئیڈیالوجی کی توضیح وتفسیر اور کبھی دفاع کا بھی ایک سچا مرکز ہونا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ مستقبل میں ذمہ دار اساتذہ اور طلباء کی ہمت و تعاون سے کالج اس پیغام کو پھیلانے کا کام بخوبی انجام دے گا۔لیکن دوسرا مسئلہ آزادی کا مسئلہ ہے۔ دیکھا جائے کہ بنیادی طور پر آزادی کیا ہے اور انسان کے کس حق میں شمار ہوتی ہے۔ عام طور پر انسان کی آزادی دو قسم کی ہے۔ ایک کو انسانی آزادی کہتے ہیں اور دوسرے کو حیوانی آزادی یعنی ہواو ہوس اور نفسانی خواہشات کی آزادی.....اگر ہم قدماء کی زبان میں بات کریں تو اس آزادی کو قوت غضبیہ اور قوت شہویہ کی آزادی کا نام دیں گے واضح رہے کہ جو آزادی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں ان کی مراد حیوانی آزادی نہیں ہوتی بلکہ وہ مقدس حقیقت ہوتی ہے جسے انسانی آزادی کا نام دیا جاتا ہے۔ انسان صلاحیتوں کا حامل ہے۔حیوانی صلاحیتوں سے بلند و برتر۔ یہ صلاحیتیں ایک قول کے مطابق اعلیٰ انسانی رجحانات،خواہشات اور جذبات ہیں یا ایک اور قول کے مطابق ادراکات وافکار ہیں۔ بہر حال یہی برتر صلاحیتیں اس کی بلندتر آزادی کو فروغ دیتی ہیں۔

یہاں ضروری ہے کہ دو آزادیوں کے بارے میں وضاحت کی جائے جن کے بارے میں اشتباہ اور مغالطہ پایا جاتا ہے آزادی فکر اور آزادی نظریہ میں فرق ہے۔ آزادی فکر اس انسانی صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے جو کہ مسائل میں غور وخوض کرتی ہے۔ یہ انسانی صلاحیت ضرور آزاد رہنی چاہئے۔ انسان کی ترقی و تکمیل اسی آزادی پر منحصر ہے لیکن نظریہ کا معاملہ الگ ہے یہ جان لیجئے کہ ہر نظریہ صحیح اور درست فکر کی پیداوار نہیں ہوتا۔ بہت سے نظریات ایک سلسلہ رسوم و رواج، اندھی تقلید اور تعصب پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ایسا نظریہ نہ صرف کوئی راہ نہیں کھولتا بلکہ فکر پر ایک قسم کا پہرہ لگا دیتا ہے یعنی انسانی فکر

اس حالت میں بجائے وا اور سرگرم ہونے کے منجمد اور مقید ہو جاتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں فکر کی یہ مقدس قوت جمود وقید کی وجہ سے انسان کے اندر اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ان معنوں میں آزادی نظریہ نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ اپنے پہلو میں معاشرے اور فرد کے لئے انتہائی نقصان دہ اثرات رکھتی ہے۔آیا اس انسان کے بارے میں جو بت کی پرستش کرتا ہے ہمیں یہ کہنا چاہئے کہ وہ فکر اور منطق کے ذریعے یہاں تک پہنچا ہے نیز اس وجہ سے کہ نظریہ قابل احترام چیز ہے پس اس کے نظریئے کا احترام کریں اور اس کی بت پرستی کے لئے کوئی رکاوٹ پیدا نہ کریں؟ یا نہیں! ہمیں یہ چاہئے کہ اس کی فکر وعقل کو اس نظریئے کی قید سے رہائی دلائیں یعنی وہی کام کریں جو ابراہیم خلیل اللہ نے کیا۔ان کی داستان تو آپ سب نے سنی ہوئی ہے۔ان کے زمانے کے لوگ اپنے رواج کے مطابق واقعی بت پرست تھے۔ایک تہوار کے موقع پر جب سب لوگ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے وہ شہر سے باہر نہ گئے بلکہ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا کلہاڑا لیا، بتوں کے پاس گئے اور انہیں توڑ دیا سوائے بڑے بت کے اور کلہاڑے کو بھی اسی بت کی گردن میں ڈال دیا، اس خیال سے کہ جب کوئی یہاں آئے تو وہ خود سوچے کہ یہ نام نہاد خدا آپس میں لڑ پڑے ہیں، نتیجۃً بڑا بت کیونکہ سب سے زیادہ طاقتور تھا اس نے باقی بتوں کو ختم کر ڈالا اور خود باقی رہ گیا۔ظاہر ہے کہ فطرت کے تقاضے پر لوگ کہیں گے کہ یہ تو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتے اور یہی فکر اور سوچ ان کو خود اپنی طرف لانے کا سبب بن جائے گی۔جب لوگ واپس آئے اور ان کی یہ حالت دیکھی، غیض وغضب میں اس معاملے کے اصل کردار کی تلاش شروع ہوئی۔اس جستجو میں انہیں یاد آیا کہ اس شہر میں ایک جوان ہے جو بت پرستی کا مخالف ہے۔اس خیال کا آنا تھا کہ فوراً ابراہیمؑ کے پاس پہنچے۔حضرت ابراہیمؑ نے ان سے فرمایا کہ مجھ پر الزام کیوں لگاتے ہو اصل مجرم تو وہی بڑا بت ہے جو زندہ رہ گیا ہے لوگوں نے جواب دیا کہ اس سے یہ کام نہیں ہو سکتا۔انہوں نے فرمایا کہ اس سے مار دھاڑ کا کام کیسے نہیں ہو سکتا جبکہ وہ انسان کی حاجات پوری کر سکتا ہے، لوگوں کے وہ کام کر سکتا ہے جن سے وہ عاجز ہوں؟ یہاں

قرآن نے ایک بہت خوبصورت اصطلاح استعمال کی ہے وہ کہتا ہے: **فرجعوا الی انفسھم**، یہ مناظرہ اس امر کا سبب بنا کہ وہ اپنی ذات کی طرف واپس پلٹ آئے۔[1] قرآن کی نظر میں انسان کی حقیقی ذات، اس کی عقل، خالص سوچ اور صحیح منطق ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ سے جدا تھے، یہ بات اس امر کا سبب بنی کہ دوبارہ خود اپنی ہی طرف لوٹ آئے ہیں اور اپنے آپ کو پالیا۔

ہمیں حضرت ابراہیمؑ کے کام کی کس طرح تشریح کرنی چاہئے؟ کیا جو کام حضرت ابراہیمؑ نے کیا وہ آزادی نظریہ کے خلاف تھا۔؟ اس رائج مفہوم میں کہ ہر شخص کو اپنے نظریئے میں آزاد ہونا چاہیے، یا یہ کہ وہ کام حقیقی معنوں میں آزادی نظریہ کی خدمت تھا!! اگر حضرت ابراہیمؑ یہ کہتے کہ کیوں کہ بت لاکھوں انسانوں کے لئے قابل احترام ہیں پس میں بھی ان کا احترام کروں یعنی درست وہی چیز ہے جو کہ سب سے زیادہ رائج ہے کیا وہ کام زیادہ صحیح ہوتا؟ اسلام کی نظر میں یہ ''اعزابہ جہل'' جہالت کی طرف گھسیٹنا ہے نہ کہ آزادی کی خدمت تاریخ اسلام میں ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فتح مکہ کے موقع پر بالکل حضرت ابراہیمؑ ہی کی نظیر پر عمل کیا۔ آپ نے آزادی نظریہ کے نام پر بتوں کو باقی نہیں رکھا بلکہ ان بتوں کو لوگوں کی فکری قید کا عامل گردانا، سینکڑوں سال سے ان لوگوں کی فکر چوبی ودھاتی بتوں کی اسیر تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فتح کے بعد آپ کا اولین اقدام ان تمام کو توڑ کر لوگوں کو حقیقی طور پر آزاد کرنا تھا۔ اب اس عظیم کردار کا انگلستان کی ملکہ کے عمل سے تو ذرا موازنہ کیجئے کہ جب وہ ہندوستان گئی تھی تو اس کے پروگرام میں ایک انتہائی آباد بت خانے کو دیکھنا بھی شامل تھا۔ ہندوستان کے عوام جب اس بت خانے کے صحن میں داخل ہونے لگتے ہیں تو

---

[1] یہ قرآنی اصطلاح جو کہ چودہ سو سال پیشتر پیش کی گئی تھی، ''خودآگاہی'' اور ''خود کی جانب بازگشت'' کی اصطلاحات اس کی مترادف ہیں جو کہ ہیگل اور مارکس کی کتابوں میں موجود ہیں اور ان پر بہت زور دیا گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے دانشوروں نے اس کو بجائے قرآن سے اخذ کرنے اور اس کے گہرے مفاہیم کو اس کتاب سے سمجھنے کے اسے مغرب سے ہی حاصل کیا

اپنے جوتے اتار لیتے ہیں مگر وہ احترام کے اظہار میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی اور ابھی صحن سے دور ہی تھی کہ اپنا جوتا پاؤں سے نکال لیا اور پھر بڑے ادب سے اس بت خانے کے سامنے کھڑی ہوئی۔اس حرکت کی توضیح کچھ سادہ لوح یوں کرتے ہیں کہ دیکھئے کہ ایک روشن فکر قوم کا نمائندہ لوگوں کے نظریات کا کس قدر احترام کرتا ہے۔ وہ اس چیز سے غافل ہیں کہ یہ سامراج کی نیرنگی ہے وہ سامراج اور استعمار جانتا ہے کہ یہ بت خانے ہی ہیں جنہوں نے اہل ہند کو زنجیر پہنا رکھی ہے اور انہیں سامراجیوں کے لئے رام کر رکھا ہے۔اس طرح کا احترام کرنا آزادی اور احترام نظریہ کی خدمت نہیں بلکہ استعمار کی خدمت ہے۔اگر قوم ہند ان خرافات کے بوجھ تلے سے نکل آئے تو دوبارہ انگریزوں کے ماتحت نہیں ہوگی۔

یا ہماری تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کورش (سائرس) کتنا عظیم الشان تھا کہ جب وہ بابل گیا اور اسے فتح کیا تو اس نے تمام بت خانوں کو محترم قرار دیا۔ایک فاتح جو سامراجی سیاست کا حامل ہوتا ہے اس کی نظر میں یہ کام ایک معمول کا واقعہ اور عام پروگرام ہوتا ہے۔مگر یہ انسانی نقطہ نظر سے کیسا ہے؟ کیا خود جناب کورش اس پر اعتقاد رکھتے تھے؟ یقیناً نہیں، لیکن کورش نے سوچا کہ یہ اعتقاد جو لوگوں کو بے خبری میں رکھتا ہے، ان کو غلام رکھنے کا بہترین عنصر ہے۔یہی وجہ تھی کہ اس نے اس چیز کو ہاتھ لگانے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

اچھا اس موضوع کو چھوڑیئے اور آزادی فکر کے مفہوم کی طرف آجائیے۔جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اسے آزادی قید فکر سے مشتبہ نہ کرنا چاہئے۔ ہر وہ مکتب فکر جو اپنی آئیڈیالوجی پر ایمان و اعتقاد رکھتا ہو اسے بہر حال آزادی فکر کا حامی ہونا چاہئے۔اس کے برعکس وہ مکتب فکر جو خود پر ایمان اور اعتماد نہیں رکھتا وہ آزادی فکر کا راستہ روکتا ہے اس طرح کے مکاتب فکر چاہتے ہیں کہ لوگوں کو فکر کے ایک خاص تنگ کنویں میں رکھیں اور ان کی فکر کو ترقی کرنے سے روکتے رہیں۔ یہ وہی صورتحال ہے جو ہم آج کل کمیونسٹ ممالک میں دیکھتے ہیں۔ان ممالک میں بگاڑ اور مرض کے شدید خوف کی وجہ سے سرکاری آئیڈیالوجی کا ہی وجود ہے حتیٰ کہ ریڈیو بھی اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ لوگ دوسرے ممالک کے ریڈیو

اسٹیشن کی آواز نہ سن سکیں۔ نتیجتاً وہی ایک سانچہ اور قالب قائم رہے جو اہل اقتدار چاہتے ہیں۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ اسلامی جمہوری نظام میں افکار کے لئے کسی محدودیت کا وجود نہیں ہے اور خبر وفکر کی نام نہاد چینلائزیشن (CHANNELISATION) نہیں ہوگی۔ سب آزاد ہونے چاہئیں تا کہ اپنی اصل فکر وسوچ کا حاصل پیش کرسکیں۔ البتہ یہ یاد رہے کہ یہ معاملہ سازش اور فریب کاری سے مختلف ہے۔ سازش ممنوع ہے لیکن بے لاگ فکر پیش کرنے کی آزادی ہے۔

دو تین روز پہلے میری ملاقات چند مارکسسٹ جوانوں سے ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ جناب آپ کے خیال میں اس نعرے: ''اتحاد، مقابلہ آزادی'' میں کیا عیب ہے؟ میں نے کہا کہ کوئی عیب نہیں۔ انہوں نے کہا تو پھر یہ نعرہ ہم دونوں میں مشترک نعرہ قرار دیا جائے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہتے ہیں اتحاد، مقابلہ تو مقابلے کے بارے میں فرمائیے کہ مقابلہ کس سے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کہیں مقابلہ تو اس سے مراد حکومت سے مقابلہ ہو، وقت گزرنے پر یہ مقابلہ مذہب سے ہو؟ کیا آپ اپنے نعرے کو ایک غلاف کے نیچے چھپا کر اور ایک مبہم عبارت میں پیش کرتے ہیں تا کہ ان لوگوں کو جو کہ مذہب کے حامی ہیں اس پرچم کے نیچے جمع کرسکیں اور پھر بتدریج ان کو غفلت میں ماریں؟ میں اس نعرے کو بلند کرنے کے لئے حاضر ہوں مگر پہلے میں واضح اعلان کرتا ہوں کہ میری مراد مقابلے سے سامراج اور کمیونزم دونوں سے مقابلہ ہے میں اسے صراحت سے کہتا ہوں اور اس سلسلے میں کسی سے خوفزدہ نہیں۔ آیئے ہم اپنی بات کو صاف طور سے کہیں تم لوگ آیت اللہ خمینی پر یقین نہیں رکھتے اور جب اکٹھے بیٹھتے ہو تو کہتے ہو کہ ہم فلاں مرحلے تک اس شخص کے ساتھ ہیں اس کے بعد اس سے مقابلہ کریں گے تو کیوں اپنے مظاہروں میں ان کی تصویر اٹھائے پھرتے ہو؟ کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ وہ شخص اسلامی جمہوریہ کی اور اپنی بات صاف کہتا ہے تم بھی اپنی بات صاف کہو۔ اظہار نظریہ کی آزادی کہو۔ یعنی تمہاری اپنی فکر کی..... یعنی اس کی جس پر حقیقت میں تم یقین رکھتے ہو۔ حالانکہ تم چاہتے ہو کہ آزادی کے

نام پر جھوٹ بولو کیونکہ جس پر تم یقین رکھتے ہو وہ ''لینن'' ہے۔ٹھیک ہے! لینن کی تصویر لاؤ۔مگر میں پوچھتا ہوں تم ہمارے رہنما کی تصویر کیوں لاتے ہو؟ تم جب امام کی تصویر لاتے ہو تو درحقیقت لوگوں کو یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں جس پر یہ رہبر گامزن ہے جبکہ تم دوسری ہی راہ پر چلنا چاہتے ہو۔جھوٹ بولنا آخر کس لئے؟ غفلت میں رکھنا کیوں؟ ہمیں آزادی فکر کو غفلت میں رکھنے کی آزادی اور منافقت کرنے کی آزادی اور فریب دہی کی آزادی اور سازش کرنے کی آزادی سے غلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔

جس طرح ہم صاف اور کھلم کھلا کہتے ہیں کہ جناب ہمارا آئیڈیل حکومتی نظام آپ کے آئیڈیل حکومتی نظام سے مختلف ہے ہمارا مستقبل کا آئیڈیل اقتصادی نظام آپ کے مطلوبہ نظام سے مختلف ہے اور ہمارا فکری اور نظریاتی نظام اور ہمارا نظریہ کائنات آپ کے فکری و نظریاتی و کائناتی نظام سے مختلف ہے۔

آپ بھی اپنی بات کھل کر کہیں، ہم اپنی بات کھل کر اور ڈنکے کی چوٹ پر کہتے ہیں تاکہ جو اس راہ پر چلنا چاہتا ہے وہ اس پر چلے۔جو نہیں چاہتا وہ دوسری راہ پر چلے۔تم کیوں اپنی بات اسی طرح کھل کر نہیں کہتے۔کیوں کہتے ہو کہ آؤ ہم آزادی کے بارے میں ایک نعرہ اپنائیں حالانکہ تم پہلے درجے میں آزادی سے مراد آزادی مذہب لیتے ہو اور ہم آزادی سے مراد ہر قسم کے دباؤ سے آزادی کو لیتے ہیں جن میں سے ایک کمیونزم کا دباؤ بھی ہے پس جو آزادی تم چاہتے ہو وہ ہماری مطلوبہ آزادی سے اختلاف رکھتی ہے۔

میں اپنے ان تمام غیر مسلم دوستوں کے لئے اعلان کرتا ہوں کہ اسلام کی نظر میں فکر و تفکر آزاد ہے تم جس طرح چاہو غور و فکر کرو۔غور کرو جس طرح چاہو۔اپنے عقیدے اور نظریئے کا اظہار کرو مگر ایک شرط ہے کہ فکر واقعی تمہاری ہونی چاہئے۔جس طرح چاہو لکھو، تحریر کرو کوئی شخص منع نہیں کرے گا۔میں نے اسی کالج میں چند سال پیشتر کالج کمیٹی کو ایک عرضداشت پیش کی تھی جس میں پیشکش کی تھی کہ اگر کوئی کالج اس قابل ہو سکتا ہے کہ اس میں کرسی مارکسزم سے مخصوص کر دی جائے تو وہ یہی الٰہیات کالج ہے مگر یہ نہیں کہ مارکسزم ایک

مسلمان استاد پڑھائے بلکہ وہ استاد پڑھائے جو واقعی مارکسزم کو جانتا ہو اور اس پر اعتقاد بھی رکھتا ہو۔ خصوصاً خدا پر اعتقاد نہ رکھتا ہو۔ چاہئے کہ ہر قیمت پر ایسے شخص کو دعوت دی جائے کہ اس کالج میں مارکسزم کے موضوعات کی تدریس کرے بعد میں ہم بھی آ کر اپنے نظریات بیان کریں گے، اپنی منطق پیش کریں گے اور کوئی شخص ہماری منطق قبول کرنے پر مجبور نہ ہو، نہ یہ سوچا جائے کہ یہ الٰہیات کا کالج ہے اس لئے اس میں مارکسزم نہیں پڑھانی چاہئے نہیں مارکسزم، پڑھائی جائے مگر اس استاد کے ذریعے جو مارکسسٹ ہو، مارکسزم پر ایمان رکھتا ہو۔ فقط جھوٹ اور فریب کاری منع ہونی چاہئے یعنی یہ کہ ایک مارکسسٹ کو قرآن کی آیت سے استنباط نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کہے فلاں آیت قرآن مارکسزم کے فلاں اصول کی جانب اشارہ ہے ہم اس انداز کے مخالف ہیں یہ قرآن کے ساتھ خیانت ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ اسلامی غلاف میں تحریریں مارکسی افکار کی تبلیغ کے لئے لکھی جاتی ہیں یہ بھی بڑی خیانت ہے میں نے اپنی کتاب ''رجحانات مادیت پسندی کے اسباب'' کے تازہ ایڈیشن کے مقدمے میں اختصار سے اس مفہوم پر تبصرہ کیا ہے کچھ عرصہ پیشتر مجھے تفسیر قرآن کے بارے میں کچھ کتابچے ملے۔ میں اب تک واقعی نہیں جان سکا کہ ان کے تحریر کرنے والے یا واالاحقیقت میں غفلت کا مارا ہے یا جان بوجھ کر دھوکا دیتا ہے البتہ یہ احتمال کرتا ہوں کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو کہ مارکسی موضوعات سے مرعوب ومجذوب ہیں۔ ان لوگوں کی کتابوں میں جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے، تمام آیات قرآن کو مارکسزم کی تشریح کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے ''الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ'' یہ لوگ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ غیب سے مراد غیب انقلاب ہے۔ انقلاب کے دو مرحلے ہوتے ہیں مرحلہ غیب اور مرحلہ حضور، جب تک سامراجی نظام سرنگوں نہ ہو جائے انقلاب پوشیدہ حالات میں رہتا ہے یعنی غیب میں رہتا ہے جب نظام تبدیل ہو جاتا ہے وہ مرحلہ حضور ہے۔ مثلاً ہم گزشتہ سال تک مرحلہ غیب انقلاب میں تھے اور اب مرحلہ حضور انقلاب میں ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیوں تم قرآن سے استنباط کرتے ہو؟ ٹھیک ہے تم صرف اپنی بات

کرو۔ اس مقام پر آزادی نظریہ کی وجہ سے ہمیں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم خاموش رہو اور اعتراض نہ کرو۔ اس کا آزادی نظریہ سے کوئی تعلق نہیں یہ کتاب مقدس قرآن کو (اپنے مقاصد کے لئے) کھلونا بنانے کی کوشش ہے یہ غفلت میں ڈالنا، سازش کرنا اور فریب کاری ہے۔ فریب کاری یعنی دوسروں سے خیانت، یعنی دوسروں کی آزادی اور دوسری کی کرامت وحقیقت کو اپنے (مقاصد کے لئے) آلہ کار بناتا ہے یہ خاموشی کا مقام نہیں ہے اس چیز کی آزادی نہیں دی جاسکتی۔

قرآن ایک آسمانی کتاب ہے وحی مجسم ہے جو شخص یہ کہے کہ اس آسمانی کتاب میں کسی معجزہ کا وجود نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ یا تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں اور بے عقل ہے یا وہ جھوٹ بولتا ہے اور درحقیقت مسلمان ہی نہیں۔ قرآن نے بہت سے معجزے بیان کیے ہیں۔ یہ پہلو قابل بحث نہیں ہے۔ جو موضوعات قرآن میں پیش کئے گئے ہیں ان میں سے ایک اصحاب فیل کا قصہ بھی ہے۔ جیسا کہ تاریخی کتابوں سے بھی معلوم ہوتا ہے اور خود قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ اہل حبش نے مکہ پر حملہ کیا تا کہ خانہ کعبہ کو تباہ کر ڈالیں۔ پھر قرآن بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پرندوں کو بھیجا۔ ان پرندوں نے ساحل بحر قلزم سے پرواز کی اور ہر ایک کی چونچ میں ایک کنکری تھی۔ قرآن نے ان پرندوں کا نام ابابیل بتایا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لفظ ابابیل اور لفظ ''آبلہ'' پھپھولے کی اصل ایک ہی ہے۔ بہر حال پرندوں نے کنکریاں اہل لشکر کے سروں پر برسا دیں اور وہ لشکری اس خرمن گندم کی طرح ہو گئے جس پر کیڑے مکوڑوں نے حملہ کر دیا ہو۔ اسی وقت زمین پر ڈھیر ہو گئے اور ہلاک ہو گئے یہاں تک مفہوم قطعی ہے مگر یہ کہ معاملے کی جزئیات وتفصیلات کیا ہیں۔ کیا لشکری چیچک یا ایسے ہی کسی اور مرض میں مبتلا ہوئے؟ ہمیں صحیح معلوم نہیں ہے۔ دوسری جانب سورہ فیل کا زمانہ نزول اس واقعہ کے چالیس سال بعد ہے اور بہت سے ایسے لوگ تھے جو اس واقعہ کے شاہد تھے اور اس کے نزول کے وقت بھی موجود تھے۔ اگر یہ واقعہ اس طرح قرآن میں بیان ہوتا جس طرح پیش نہیں آیا تھا تو وہ تمام لوگ جو کہ واقعہ کے گواہ تھے اور رسول

اللہؐ کے دشمن بھی، سب آپؐ پر جھوٹ کا الزام لگا دیتے اور آپؐ کی بات کا اعتبار نہ کرتے۔ اس سورت کی تفسیر میں اس کتابچے میں یہ عبارت آرائی کی گئی ہے کہ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانہ پیدائش میں مکہ میں ایک انقلابی گروہ موجود تھا، جو عالمی سامراج سے برسر پیکار تھا۔ سامراج کو اس انقلابی گروہ کا پتہ چل گیا اور وہ اسے ختم کرنے کے لئے مکہ پر حملہ آور ہوا۔ یہ گروہ پرندوں کی طرح اڑتا اور مقابلہ کرتا رہا۔ آخر میں یہ نام نہاد شرح نگار لکھتا ہے کہ صرف اس بنا پر ہمیں اپنی تشریح اور نقطہ نظر تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی تشریح تاریخ میں کہیں بھی مذکور نہیں۔

قرآن سے اس طرح کے نتائج نکالنا صحیح نہیں ہے۔ میں ان بھائیوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ اگرچہ تم دیکھتے ہو کہ کچھ لوگ آیات کی تفسیر میں اسقدر احتیاط برتتے ہیں کہ اسے وسوسوں کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگرچہ میں اس سے بھی متفق نہیں۔ پھر بھی وہ یہ تو نہیں کرتے کہ جو دل چاہا آیات قرآنی کے نام سے لکھ دیا۔ لیکن اس کے مقابلے میں ہمیں افراط کی راہ بھی اختیار نہیں کرنی چاہئے۔ اسلام کہتا ہے کہ تمام کائنات اس کے قوانین اور اس کے تمام اجزا پتھر سے لے کر پانی، ہوا، پرندے، مچھلی وغیرہ تک سب کے سب ارادہ حق کے تحت مسخر ہیں اور بمنزلہ خدا کے سپاہی شمار ہوتے ہیں۔ ہوا کے لئے کافی ہے کہ اس کا ارادہ حق سے اتصال ہو جائے اور وہ بصورت لشکر چلی آئے۔

جملہ ذرات زمین و آسماں
لشکر حق اندگاہ امتحاں

آسمان و زمین کے تمام ذرات وقت امتحان خدا کے لشکر ہیں۔

اگر خدا چاہے تو دنیا کے حالات کو جس طرح چاہے تبدیل کر سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ اس طرح کے افکار کے حامل لوگ ان حقائق کو نہیں سمجھنا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں، کیونکہ مادہ اور مادیات قائم بالذات ہیں اس لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے راستے سے ہٹ جائیں۔ یوں یہ لوگ آتے ہیں اور تفسیر آیات یوں کرتے ہیں۔ میں واضح طور پر خطرے کا اعلان کرتا

ہوں کہ ایسے افکار کی نشر و اشاعت اسلام کی خدمت نہیں بلکہ سامراج کی خدمت ہے۔

اپنی معروضات کے آخر میں ضروری ہے کہ میں ایران کی آئندہ اسلامی حکومت کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دوں۔ جیسا کہ ہمارے رہبر اور امام نے بار بار ارشاد فرمایا ہے۔[1] کہ اسلامی حکومت میں سیاسی پارٹیاں آزاد ہیں۔ کوئی پارٹی اگر غیر اسلامی نظریہ رکھتی ہے۔ تب بھی آزاد ہے لیکن ہم سازش اور فریب کی اجازت نہیں دیتے۔ پارٹیاں اور اشخاص جب تک اپنا نظریہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں، اپنی منطق کے ذریعے ہماری منطق سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ہم انہیں قبول کرتے ہیں لیکن اگر وہ یہ چاہیں کہ پرچم اسلام تلے اپنے غیر اسلامی افکار و نظریات بیان کریں تو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اسلام کا دفاع کریں اور کہیں کہ اسلام ایسی بات نہیں کہتا۔ ہمیں حق پہنچتا ہے کہ کہیں اسلام کے نام پر یہ کام نہ کرو۔ ہم سوچ نہیں سکتے کہ کہیں اور بھی ایسی بحث و گفتگو کی آزادی رہی ہو۔ آپ نے تاریخ عالم میں کہاں دیکھا ہے کہ ایسی مملکت میں جہاں تمام لوگ مذہبی احساسات رکھتے ہوں لادینوں کو اس قدر آزادی دی گئی ہو کہ وہ آئیں اور مسجد نبوی یا مکہ میں آکر بیٹھیں اور جس طرح چاہیں اپنے نظریات کا پرچار کریں، خدا کا انکار کریں رسالت کے منکر ہوں اور نماز، روزہ، حج وغیرہ کو یہ کہہ کر مسترد کریں کہ ہم انہیں تسلیم نہیں کرتے لیکن معتقدین مذہب ان کے ساتھ احترام کا سلوک کریں۔ ہم تاریخ اسلام میں ایسی درخشاں مثالیں بہت پاتے ہیں۔ یہی آزادیاں اس بات کا سبب تھیں کہ اسلام باقی رہ سکا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اگر کوئی شخص آتا اور کہتا کہ میں خدا کو نہیں مانتا تو اس سے کہا جاتا کہ بات کرو، دلیل دو۔ آج بھی کوئی دوسرا اسلام نہیں ہے۔ اسلام اسی وجہ سے زندہ رہا ہے کہ مختلف افکار کا شجاعت اور وضاحت سے سامنا کرتا رہا ہے۔ داستان مفضل آپ سب نے سن رکھی ہے۔ آپ امام جعفر صادق علیہ السلام کے ایک صحابی تھے ایک روز مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اسی وقت

---

[1] ہمارے رہنما اور دیگر رہنماؤں میں یہ فرق ہے کہ وہ کچھ کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے جبکہ دوسرے رہنما پہلے سرخ وسبز باغ دکھاتے ہیں، پھر اپنے تمام سابقہ دعوؤں سے پھر جاتے ہیں۔

مادہ پرست مذہب کے دو آدمی داخل ہوئے اور ان کے قریب بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ گفتگو میں انہیں نے رسول اللہؐ کے بارے میں موضوع چھیڑا اور کہا کہ وہ ایک انتہائی ذہین اور نابغہ انسان تھے جو معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ تبدیلی مذہب کے ذریعے لائی جائے حالانکہ وہ خود اللہ اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے لیکن انہوں نے مذہب کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ یہ سن کر مفضل کو بہت غصہ آیا اور ان سے جھگڑنے لگے ان دونوں نے کہا کہ پہلے یہ بتاؤ کہ تم کس جماعت سے تعلق رکھتے ہو اور کس کے پیروکار ہو۔ اگر امام جعفر صادق علیہ اسلام کے پیروکار ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم ان کے حضور میں ایسی بلکہ اس سے بھی اونچی باتیں کر لیتے ہیں کہ گویا آپ قائل ہو گئے مگر جب ہماری بات ختم ہو جاتی ہے تو وہ بڑی قناعت سے اس کا جواب دیتے ہیں اور اس کی تردید کرتے ہیں۔

یہ انداز تھا کہ جس کی بنا پر اسلام زندہ رہا۔ آپ غور کیجئے کہ پوری تاریخ اسلام میں مادہ پرستوں کے افکار اور اعتراضات کو کس نے واضح اور محفوظ رکھا ہے؟ کیا خود مادہ پرستوں نے؟ نہیں! چلئے مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ مادہ پرستوں کے افکار کو صرف علمائے مذہب نے ہی محفوظ رکھا ہے یعنی انہوں نے مدتوں پہلے ان افکار کو اہل مذہب کے سامنے پیش کیا۔ علمائے مذہب نے بھی ان سے مباحثہ کیا اور پھر ان کے ان افکار کو اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا یہ تمام افکار علمائے مذہب کی کتابوں میں داخل ہونے کی وجہ سے ہمارے زمانے تک باقی رہ گئے ہیں ورنہ ان کے آثار و تصانیف یا تو ختم ہو گئی ہیں یا ہماری دسترس میں نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر آپ احتجاجات طبرسیؒ یا احتجاجات بحار کو ملاحظہ فرمائیے کہ کس قدر انہوں نے اس گروہ کے افکار و خیالات کو اپنی کتابوں میں ظاہر کیا ہے۔ اسلام آئندہ بھی غیر اسلامی نظریات کا صرف اور صرف واضح اور بہادری کے ساتھ سامنا کر کے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ میں جوانوں اور حامیان اسلام کو آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ معتقدات اسلامی کے تحفظ کی راہ فقط دوسروں کے اظہار نظریہ پر پابندی لگانے میں ہے

بلکہ اسلام کی صرف ایک ہی قوت سے حفاظت ہوتی ہے اور وہ ہے علم وآگہی اور مخالف افکار کو اظہار کی آزادی دینا اور ان سے واضح اور روشن مقابلہ کرنا۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنی گفتگو جاری رکھنے کے لئے زیادہ وقت نہیں رکھتا اور ساتھ ہی ساتھ یہ معذرت بھی کرتا چلوں کہ پہلے سے کسی خاص موضوع پر غور نہیں کر سکا۔ بہر حال امید کرتا ہوں کہ اس کالج کو اپنا رسالتی فریضہ انجام دینے کی توفیق حاصل ہوگی۔ اور نہ صرف اس کالج کو بلکہ عوام کے دیگر ذمہ دار طبقوں کو بھی یہ توفیق حاصل ہوگی۔

ہماری تحریک نے پوری دنیا پر ایک بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ ایران میں آج کل جو جلوس نکل رہے ہیں ان کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی، اس جمعہ کے روز جو اجتماع دیکھنے میں آیا ہے [1] وہ شاید دنیا میں بے نظیر ہے۔ میرے بھائیو! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کس طاقت نے اس ملک کے ساڑھے تین کروڑ افراد کو یا کم از کم تین کروڑ لوگوں کو حقیقی طور پر انقلابی بنا دیا ہے؟

جنہوں نے انقلابات دنیا کی تاریخ میں مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ عوامی شمولیت وقبولیت کے لحاظ سے کوئی انقلاب بھی ایرانی انقلاب کے پائے کا نہیں مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے کہ ان ہوا باز بھائیوں کے بارے میں شاید کسی کو کم ہی یہ خیال آیا ہوگا کہ احساسات واعتقادات مذہبی اس گروہ کی روح میں اتنے قوی وطاقتور ہیں۔

یہ لوگ تمام تر دہشت کے باوجود ایمان واعتقاد کے سہارے پر ہڑتال کر رہے تھے اور کسی قوت یا کسی دھمکی سے مرعوب نہ ہوئے۔ لیکن جب امام کی آمد کا اعلان ہوا تو وہ امام کو لانے کو تیار ہو گئے۔ حکومت نے انہیں دھمکیاں بھی دیں۔

انہوں نے خود مجھے بتایا کہ حکومت کی جانب سے انہیں تنبیہ کی گئی تھی کہ اب تمہاری کوئی ضمانت نہیں۔ اگر تم لوگ فضا میں جاؤ گے تو تمہیں راکٹ کا نشانہ بنا کر ختم کر دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس کے باوجود جائیں گے تم جو چاہو کرو۔ ناچار حکومت باز

---

[1] امام خمینی کا تہران میں آمد کا دن

رہی اور ایک پرواز کے آنے کی اجازت دے دی۔ ہوابازوں نے اس پرواز کا نام ''پرواز انقلاب''رکھا۔ کتنا دلکش نام ہے!

کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مذہب لفظ بوڑھے لوگوں، بڑھیا عورتوں اور جنوب شہر [۱] رہنے والوں کی چیز ہے۔ وہ تحریک کہ جس میں شہری و دیہاتی، مزدور و کسان، استاد و طالب علم اور وکیل و افسر سب کے سب شریک ہوں وہ بنیادی طور پر مذہب کے سوا خاص طور سے اسلام کے سوا بھلا کس چیز سے قوت حاصل کرسکتی ہے، جو اس قسم کے انقلاب ایران تک لائے۔ میرے دل میں رفتہ رفتہ یہ امید ابھرتی ہے کہ یہ انقلاب ایران تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ بلکہ ستر کروڑ مسلمانوں کا مطمع نظر قرار پائے گا اور یہ ایران کے لئے کتنے فخر کی بات ہوگی کہ ایک اسلامی انقلاب ایران سے شروع ہوا اور تمام اسلامی ممالک میں اس کے اثرات نفوذ کر جائیں۔ مجھے ایک اطلاع ملی ہے جس سے خاصا اطمینان ہوا ہے کہ چند روز پیشتر جمی کارٹر [۲] نے آیت اللہ خمینی کو شاپور بختیار [۳] کے بارے میں خبردار کیا کہ دونوں سپر طاقتیں اس کی حکومت کی حامی ہیں اس لئے آپ اپنا حساب کر لیجئے۔ لیکن اس عظیم شخص نے اس دھمکی کی پرواہ نہیں کی۔ میں جو کہ قریب بارہ برس اس عظیم شخص کی خدمت میں تحصیل علم کرتا رہا ہوں۔ جب پیرس سے آخری سفر کے موقع پر آپ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو میں نے آپ کی روحانیت میں وہ چیز محسوس کی جس نے میری حیرت ہی میں نہیں بلکہ ایمان میں بھی اضافہ کیا۔ جب میں واپس لوٹا اور دوستوں نے پوچھا کہ کیا دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ چار قسم کا ایمان دیکھا ہے۔

۱۔ ایمان بر ہدف: انہیں اپنے ہدف اور مقصد پر ایمان و یقین ہے۔ اگر تمام دنیا جمع ہو جائے تو بھی انہیں اپنے مقصد سے برگشتہ نہیں کرسکتی۔

---

[۱] غریب و مستضعف عوام مراد ہیں کیونکہ تہران کے جنوبی علاقوں میں غریب لوگ ہی آباد ہیں مترجم

[۲] اس وقت کا امریکی صدر

[۳] شاہ ایران کا آخری وزیر اعظم جو انقلاب کی کامیابی کے بعد (امام کی آمد کے بعد ملک سے فرار ہوگیا)۔

۲۔ ایمان بر سبیل: جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے اس پر ایمان ویقین ہے۔ ان کو راستے سے ہٹانا ممکن ہی نہیں۔ اس ایمان کی طرح جیسا کہ پیغمبران خدا اپنے مقصد اور اپنے راستے پر رکھتے ہیں۔

۳۔ ایمان برقوم: میں اپنے تمام رفقاء اور دوستوں میں کسی کو ایسا نہیں پاتا کہ ایران کے عوام کے روحانی جذبے پر اس قدر یقین رکھتا ہو۔ لوگ آپ سے گزارش کرتے کہ جناب والا اپنے موقف کو کچھ نرم رکھئے۔ عوام کا جذبہ جلد ٹھنڈا ہو جایا کرتا ہے۔ عوام ثابت قدم نہیں رہا کرتے۔ آپ فرماتے ہیں، عوام ایسے نہیں جیسا کہ تم بتاتے ہو میں عوام کو زیادہ بہتر جانتا ہوں اور ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ دن بدن آپ کی بات کی صداقت زیادہ سے زیادہ آشکار ہوتی جارہی ہے۔

۴۔ اور آخر کار سب سے بالاتر ایمان! ایمان بررب: اپنے رب پر زبردست ایمان ہے ایک خصوصی ملاقات میں آپ نے مجھ سے فرمایا کہ ہم ایسے نہیں ہیں جو یہ کام کرسکیں (یعنی انقلاب برپا کرسکیں) بلکہ میں دست خدا کو بالصراحت محسوس کرتا ہوں۔ جو شخص دست خدا اور عنایت ایزدی کو محسوس کرتا اور راہ خدا پر گامزن ہوتا ہے خدا بھی آس آیت (ان تنصروا اللہ ینصرکم) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا) کے مصداق اس کی مدد میں اضافہ کرتا ہے یا جیسا کہ اصحاب کہف کے قصے میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ ایسے جوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے اور اسی پر اعتماد وانحصار کرتے تھے، خدا نے بھی ان کے ایمان میں بڑھوتری دی۔ [۱] وہ خدا کے لئے حکومت سے بغاوت پر آمادہ ہوئے۔ خدا نے بھی ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ [۲]

اسی قسم کی ہدایت اور تائید ایزدی میں نے اس شخص میں پائی ہے۔ اس نے خدا کے لئے حکومت سے بغاوت کی ہے اور خدا نے بھی اس کو مضبوط دل عنایت کیا ہے کہ جس

---

[۱] اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ الکھف: ۱۳

[۲] وَّرَبَطْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ الکھف ۱۴

میں خوف وہراس کا گزر رہی نہیں۔ فرانسیسی ڈاکٹروں نے اس ۸۷ سالہ بزرگ کا جو کہ کم از کم پندرہ سال سے اعصابی جنگ سے دوچار ہے اور جس نے آخر کار اپنا ایک ہونہار جوان بیٹا بھی اس راہ میں قربان کر دیا۔ [1] معائنہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ان کا دل ایک بیس سالہ نوجوان کے دل جیسا ہے، جو راہ خدا میں قدم اٹھاتا ہے اس سے قرآن نے جو وعدہ کیا ہے وہ اس نے تجربے سے دیکھ لیا ہے۔

قرآن نے وعدہ کیا ہے کہ خدا کے لئے اٹھ کھڑے ہو اور خدا ہی کے لئے کام کرو تو عنایت خدا کو اپنے قریب پاؤ گے۔ اگر تو گھر میں بیٹھ رہے گا تو خدا کو نہ پائے گا، اگر خاموشی اختیار کرے گا تو عنایت خدا کو نہ پائے گا۔ خدا کے لئے حرکت کر تو خدا اور عنایت خدا کو پالے گا جو آدمی خدا کی امید پر خدا کے لئے حرکت کرتا ہے تو امریکہ کی دھمکی سے حتیٰ کہ اگر اس میں روس کی دھمکی بھی شامل ہو اپنے دل میں ذرا سا بھی خوف نہیں آنے دیتا۔

اس مرد عظیم کے بارے میں ایک اور بات بتاتا چلوں شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ یہ شخص جو زمین پر بیٹھا روز یہ آتشیں اعلامیے جاری کرتا رہتا ہے، رات کے آخری پہر میں کم از کم ایک گھنٹہ اپنے خدا سے راز و نیاز کرتا ہے اور یوں آنسو بہاتا ہے کہ جس کا یقین کرنا مشکل ہے۔

یہ شخص صحیح حضرت علی علیہ السلام کا پرتو ہے جناب علی علیہ السلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں خندہ لب تشریف لاتے تھے اور محراب عبادت میں شدت گریہ وزاری سے بے ہوش ہو جاتے تھے۔ ہم ان کا عکس اس شخص میں دیکھتے ہیں۔

میں امید کرتا ہوں کہ خدا اس رہبر کو عمر طویل اور توفیق خدمت عنایت فرمائے اور ہم سب کو بھی توفیق دے کہ اسلام کے صحیح اور منطقی محافظ بنیں

والسلام

---

[1] آپ کے بیٹے حجۃ الاسلام مصطفیٰ خمینی کی جانب اشارہ ہے جو انقلاب سے ایک سال پیشتر خفیہ طور پر شہید کر دیئے گئے (مترجم)۔

ایران کے انقلابِ اسلامی کی حقیقت

اور اس کے عوامل

یہ باب جناب مطہری شہید کی مسجد جوادؑ میں کی گئی ان چند تقاریر کا مجموعہ ہے جو آپ نے ماہ فروردین ۵۸ ہجری شمسی میں کی تھیں، یہ مرحوم کی آخری عام تقاریر میں شمار ہوتی ہیں۔ ان تقاریر میں پیش کئے گئے بعض نکات مسجد فرشتہ کی تقاریر کے نکات سے ملتے جلتے ہیں اس لئے مزید تشریح کی خاطر حاشیے میں ان تقاریر کے نکات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

آغاز سخن میں قرآن کریم کی ایک آیت کی تلاوت کرتا ہوں اور یہی اس تقریر کا دیباچہ ہوگی۔ خدائے رحمن سورہ مبارکہ مائدہ میں ارشاد فرماتا ہے:

فِسْقٌ ط اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا

تَخۡشَوۡهُمۡ وَاخۡشَوۡنِ ؕ [1]

مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اب کافر تمہارے دین سے مایوس ہو گئے ہیں کہ تمہارے دین سے مقابلہ کر سکیں، تمہارے دشمنوں نے قطعی شکست پائی ہے اور اب ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا، لیکن آج جو کہ کامیابی کا دن ہے ایک اور چیز سے ڈرنا چاہئے اور وہ ہے مجھ سے ڈرنا۔ [2] مفسرین نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اب خطرہ تمہارے اندر سے ہے، نہ کہ باہر سے یعنی خطرہ بالکل ختم نہیں ہوا بلکہ صرف خارجی دشمنی کا خطرہ ٹلا ہے۔ ''خدا سے ڈرنا'' جو آیت میں آیا ہے وہ خدا کے قانون سے ڈرنے کے معنی میں ہے۔ اس چیز سے ڈرنا کہ وہ ہم سے اپنے فضل سے نہیں بلکہ عدل سے سلوک کرے۔ امیر المومنین علیہ السلام سے ماثورہ دعا میں ہم پڑھتے ہیں:

''اے وہ کہ جس کے عدل کے سوا کسی چیز سے نہیں ڈرا جاتا۔'' ایک ایسا عادلانہ نظام کہ جس میں کسی پر حقیقتاً ذرا سا بھی ظلم نہیں ہوتا، انسان ایسے نظام کے نافذ ہونے سے ڈرتا ہے۔ اس کو ڈر ہوتا ہے کہ مبادا کسی غلطی کا مرتکب ہو جائے اور سزا کا مستحق ٹھہرے۔

---

[1] سورۂ مائدہ کی تیسری آیت کا ایک حصہ سورہ مائدہ رسول اللہ پر نازل ہونے والی آخری سورتوں میں سے ہے۔ بعض علماء نے اس کو آخری سورت قرار دیا ہے۔ ان آیات کے نزول سے وفات رسولؐ تک کا عرصہ دو ماہ سے زیادہ نہیں ہے یہ سورت اسلام کی کامیابی اور مخالفین کی جزیرہ عرب میں کامل شکست کے بعد نازل ہوئی۔ ان مخالفین میں طاقتور عرب قبائل مثلاً قریش، ہوازن، بنی مصطلق اور غطفان وغیرہ کے علاوہ اہل کتاب خاص طور سے یہودیوں کے بنی قریظہ، بنی نضیر اور خیبر کے یہودی اور دیگر گروہ شامل ہیں۔

[2] مجمع البیان میں علامہ طبرسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ '' الیوم '' سے مراد بمعنہ آج کا دن مراد نہیں بلکہ اس سے مراد ''اب '' ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی کافروں سے خوف کی حالت کو تبدیل کر دیا ہے اور وہ اسلام کو نابود کرنے سے مایوس ہو گئے ہیں اور جس چیز کا تم سے وعدہ تھا وہ آ گئی کہ: لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ یعنی وہ دین کو تمام پر غالب کر دے گا اور دین ان سب چیزوں کا نام ہے جس سے مخلوق اللہ کی عبادت کرتی ہے اور اس کو قائم کرتی ہے۔ ''داخشون ''، لیکن مجھ سے ڈرو اگر تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی اور میری نافرمانی کی تو میرا عذاب تم کو آئے گا..... تفسیر مجمع البیان ۱:۱۵۸:۱۵۹ مترجم

اسی لئے کہتے ہیں کہ خدا سے ڈرنا آخر کار خود سے ڈرنا ہے۔ یعنی اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں سے ڈرنا۔

یہ آیت مسلمانوں سے یہ بھی کہہ رہی ہے کہ اپنی فتح اور دشمن کی شکست کے بعد اب بیرونی دشمن سے نہیں بلکہ اندرونی دشمن سے ڈرتے رہو۔ اس مشہور حدیث کے مفہوم کے مطابق جب رسول اکرمؐ ایک غزوہ سے واپس آنے والے جانبازوں سے ارشاد فرماتے ہیں: تم چھوٹے جہاد سے فارغ ہو گئے اب جہاد اکبر باقی ہے۔[1]۔

مولانا روم کہتے ہیں:

اے شہان کشتیم ما خصم بروں
ماندہ خصمی زان بتر در اندروں

ہمارے سردارو! ہم نے اپنے بیرونی دشمن کو تو مار لیا ہے مگر ہمارے اندر اس سے بڑا دشمن ابھی باقی ہے۔

یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے یہ تاریخ اسلام کا تجزیہ کرنے کے لئے سورہ رعد کی گیارہویں آیت کے ساتھ خاص مناسبت رکھتی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

بے شک اللہ کسی قوم کے حالات اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود کو نہ بدلیں

تاریخ اسلام کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ وفات رسولؐ کے بعد انقلاب اسلامی کا وہ راستہ تبدیل ہو گیا جسے حضورؐ نے مقرر فرمایا تھا۔ موقع پرست افراد کی رخنہ اندازی اور ان دشمنوں کی رخنہ اندازی کے سبب جو کل تک اسلام سے جنگ آزماتھے لیکن بعد میں بہروپ بدل کر مسلمانوں کی صفوں میں گھس گئے، اس انقلاب کا راستہ، اس کی شکل اور اس کا دائرہ اس قدر بدل گئے کہ پہلی صدی ہجری کے آخر تک اسلامی ماہیت کا انقلاب بس قومی اور عربی

[1] مرحبا بقوم قضوا الجهاد الاصغر وبقی علیهم الجهاد الاکبر

انقلاب سمجھا جانے لگا۔ رسولؐ کے بعد آنے والوں نے یہ یقین رکھنے کی بجائے کہ دین اسلام اور اس کی اقدار ہی اصل میں کامیاب ہوئی ہیں اور بجائے اس کے کہ انقلاب اسلامی کے نتائج کے تسلسل وتحفظ کے لئے انہی اسلامی معیاروں اور اصولوں پر یقین رکھتے، انہوں نے یہ نظریہ بنالیا کہ یہ انقلاب اپنی ماہیت میں بس قومی اور عربی ہے اور یہ قوم عرب ہی ہے جس نے غیر عربوں سے جنگ کی اور انہیں شکست دی۔ ظاہر ہے کہ یہی بات اسلامی معاشرے میں شگاف ڈالنے کو کافی تھی۔ یہ تفرقہ اور علیحدگی دو جدا شکلوں میں رونما ہوئی۔ اول، صحیح اسلام کی واپسی کے نعرے سے ایک گروہ نے پوری صداقت سے یہ دعویٰ کیا کہ جو اسلام تم پیش کرتے ہو وہ صحیح اسلام نہیں ہے کیونکہ حقیقی اسلام میں عربوں کی قومی ونسلی برتری کے موضوعات شامل نہیں ہیں۔ ایک اور گروہ نے اس مسئلے کو یوں پیش کیا کہ اگر اسلام میں قومیت کا تصور ہے تو کیوں عرب قوم ہی ہو؟

کیوں نہ ہمیں بھی آقائی اور سروری ملے؟ اس طرح امت مسلمہ میں قومی ونسلی یا آج کی اصطلاح میں نیشنلسٹی کشمکش کا بیج بو دیا گیا۔

اسلام کی ابتدائی دو تین صدیوں کی تاریخ، عربوں، ایرانیوں، ترکوں اور ماورالنہر کی اقوام کے درمیان جنگ و جدل سے بھرپور ہے۔ ابتداء میں بنوامیہ کے زمانے میں عرب نسل پرستی کا زور رہا۔ جب بنوعباس کو خلافت ملی تو باوجودیکہ وہ عرب تھے لیکن چونکہ بنوامیہ کے مخالف تھے اس لئے انہوں نے ایرانیوں کو تقویت دی اور فارسی زبان ورسم الخط کو رواج دیا بعد میں متوکل عباسی نے جس نے ترک نسل سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور خود کو ایرانیوں کے اثر سے آزاد کرنا چاہتا تھا، ترکوں کو امور حکومت پر مسلط کر دیا۔ [1] اور عربوں اور ایرانیوں کو ترکوں کی غلامی میں دے دیا۔

آج ہمیں بھی وہی صورتحال درپیش ہے جو رسول اللہؐ کے آخری دور میں تھی جس

---

[1] معتصم اور اس کے بیٹے ہارون کی موت کے بعد دو ترک سرداروں واصیف اور اتیاخ نے ہارون کے بھائی جعفر کو خلافت نشین کیا۔ جس کی ماں خوارزمی میں سے ایک کنیز تھی اور اسے متوکل علی اللہ کا لقب دیا۔

میں آیت ''اَلْیَوْمَ یَئِسَ الَّذِیْنَ ''نازل ہوئی تھی۔ہمیں بھی قرآن کا پیغام یہی ہے کہ اب جبکہ ہم نے بیرونی دشمن پر فتح پالی ہے اور اس کی قوت کو درہم برہم کر دیا ہے اس سے خوف نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اب خود سے ہی ڈرنا چاہئے۔تحریک اور انقلاب کے انحراف سے ڈرنا چاہئے۔اگر ہم نے انقلاب کے عملی مسائل کا حقیقت بینی اور کامل غور و خوض سے سامنا نہ کیا اور ذاتی پسند اور تعصّبات میں گرفتار ہو گئے تو ''وَاخْشَوْنِ'' کے اسول کی بنیاد پر اور ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ '' کے اصول کی بنیاد پر ہمارے انقلاب کی شکست حتمی ہو گی بالکل ایسے ہی جیسے کہ صدر اسلام کی تحریک کو بھی انہی بنیادوں پر شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

عام طور پر جس اصول کی صداقت مسلم ہے وہ یہ ہے کہ کسی چیز کی حفاظت اس کے حصول سے زیادہ مشکل ہے اور اگر مشکل نہیں تو آسان بھی نہیں۔قدما کہتے ہیں کہ جہانگیری، جہانداری سے آسان ہے۔ہمیں بھی جاننا چاہئے کہ انقلاب بپا کرنا انقلاب کی حفاظت کرنے سے زیادہ آسان ہے۔خود اپنے انقلاب کو ہم بہ صراحت دیکھتے ہیں کہ جب تعمیر نو کے حالات پیش آئے ہیں تو وہ قوت اور سرگرمی بہت ہی کم ہو گئی ہے اور اس میں اس طرح کا انتشار پیدا ہو گیا ہے، بمقابلہ اس وقت کے کہ جب انقلاب بیرونی دشمن کی سرکوبی میں مصروف تھا۔البتہ یہ کمی اور انتشار ناقابل پیش بینی نہ تھا پہلے ہی یہ اندازہ تھا کہ شاہ کے جاتے ہی وہ وحدت و یک رنگی جو عوام میں ہے کمزور پڑ جائے گی۔

معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب کی ماہیت کے بارے میں اس تحقیق کی ضرورت ہے کہ یہ ایک اجتماعی اظہار ہے۔ہمیں اپنے انقلاب کو پہچاننا اور اس کے تمام پہلوؤں کا خوب تجزیہ کرنا چاہئے۔اسے جاننے اور تجزیہ کرنے ہی سے انقلاب کو تسلسل بخشنے اور حفاظت و نگہداشت کرنے کا امکان پیدا ہوگا۔یہ ضروری ہے کہ انقلابیوں کے بارے میں بھی ایک مجموعی تحقیق کی جائے پھر انقلاب ایران پر خاص طور سے تحقیق کی جائے۔پہلے قدم پر دیکھنا چاہئے کہ انقلاب کیا ہے؟ انقلاب ایک سرزمین یا ایک مملکت کے عوام کی پہلے سے موجودہ نظام حکمران نظام کیخلاف اور ایک مطلوبہ نظام قائم کرنے کے لئے بغاوت و نافرمانی کا نام

ہے۔ دیگر الفاظ میں انقلاب پہلے سے موجود حالات کے خلاف ایک نئی حالت پیدا کرنے کی خاطر بغاوت سے عبارت ہے۔[1] یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر انقلاب کی بنیاد دو چیزوں

---

[1] انقلاب اور کودتا (فوجی یا مسلح بغاوت) میں فرق یہ ہے کہ انقلاب کی ماہیت عوامی ہوتی ہے، لیکن کودتا میں ایک مسلح اور طاقتور اقلیت دوسری اقلیت کے خلاف جو کہ اکثریت پر حکمران ہوتی ہے بغاوت کرتی ہے اور موجودہ حالت کو تبدیل کر دیتی ہے اور خود پہلے گروہ کی جگہ سنبھال لیتی ہے اور اس کا انقلابیوں کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ بات اہم ہے کہ کودتا میں عوام کی اکثریت خارج از حساب ہوتی ہے اور عمل اور ردعمل میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ ہم ایرانیوں نے اپنی عمر میں بہت سے ایسے انقلاب دیکھے ہیں اگرچہ ان کے کرتا دھرتا لوگوں نے انہیں انقلاب ہی کا نام دیا ہے۔ ۱۹۵۲ھ میں مصر میں جنرل نجیب اور جمال عبدالناصر کی قیادت میں کچھ افسروں نے حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کی۔ اس بغاوت میں جو کہ انقلاب کے نام سے مشہور ہوئی اور اسے عوام نے برپا نہیں کیا، یہ بات تھی کہ ان افسران کے جانے کے بعد " لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا۝ " گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایران میں ۱۲۹۹ھ میں سید ضیا اور رضا خاں نے فوجی بغاوت کی، اس میں بھی عوام کسی شمار میں نہ تھے۔ حالیہ تاریخ کی آخری چند صدیوں میں سوائے انقلاب فرانس اور انقلاب اکتوبر کے کسی کو بھی انقلاب کا نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ انقلاب روس اور انقلاب چین میں بھی عوام کے پہلو میں ایک طاقتور اور منظم فوج موجود تھی۔

ان انقلاب نما بغاوتوں کے درمیان، ایران کا اسلامی انقلاب ہی حقیقی معنوں میں ایک انقلاب ہے۔ اگر اس کی نظیر اور مثال تلاش کریں تو بس صدر اسلام کے انقلاب کی مثال دے سکتے ہیں اس انقلاب کی انقلابی ماہیت تاریخ کے بہت سے اصل انقلابوں سے زیادہ تر اصل ہے۔ اس انقلاب میں سرزمین کے عوام اور ایک قوم کے افراد کی اکثریت، زن و مرد و پیر و جوان خالی ہاتھ لیکن زبردست انقلابی جذبے کے ساتھ ایک طاقتور حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور فتح حاصل کرتے ہیں۔

انقلاب کے مقابلے میں ایک نقطہ اصلاح قرار دیا جاتا ہے جو معاشرے میں کچھ معمول کی وہ تبدیلیاں پیدا کرتا ہے جو بنیادی نہ ہوں یعنی معاشرے کی بنیادوں پر اور اس کی اصل عمارت اور جاری نظام کو درہم برہم نہیں کرتا بلکہ صرف حالات کی بہتری کے لئے کچھ تبدیلیاں لاتا ہے اسے اصلاح کہتے ہیں۔

انقلاب اور اصلاح صرف معاشرے کے معاملے ہی میں نہیں بلکہ افراد کے معاملے میں بھی صادق آتے ہیں مثلاً کبھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک فرد کے اخلاقی کردار اور معاشرتی رویے کی صورتحال پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے۔ لیکن کبھی افراد میں بنیادی طور پر روحانی تبدیلی بھی پیدا ہوتی ہے اتنی کہ گویا یہ شخص وہ کل والا شخص نہیں رہتا۔ اسلامی اصطلاح میں تو یہ ایک روحانی انقلاب برپا کرنے اور کردار اور رویے میں بنیادی تبدیلی لانے کا نام ہے۔

پر ہے ایک تو موجود حالت سے ناراضگی اور دوسرے ایک مطلوبہ حالت کی خواہش، انقلاب کا جاننا درحقیقت ناراضگی کے عوامل اور ان کے مقاصد کو پہچاننا ہے۔

بطور مجموعی انقلابیوں کے بارے میں دو نظریات ہیں۔ ایک نظریہ تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام سماجی انقلاب خواہ ان کی ظاہری شکلیں مختلف ہوں لیکن ان کی روح اور ماہیت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس نظریئے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام انقلاب خواہ وہ آغاز اسلام کا انقلاب ہو یا فرانس کا عظیم انقلاب یا انقلاب اکتوبر یا چین کا ثقافتی انقلاب وغیرہ اگرچہ ان کی شکلیں مختلف ہیں مگر حقیقت میں ایک ہی جیسے انقلاب ہیں گو بظاہر ایک انقلاب علمی ہے تو دوسرا سیاسی اور وہ مذہبی علی ہذا القیاس، اس کے باوجود ان سب کی ماہیت اور روح ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ہے ''اقتصادی اور مادی مسئلہ یوں'' انقلابات ٹھیک اس بیمار کی مانند ہیں جو مختلف مواقع پر مختلف علامات اور تکالیف کا اظہار کرتا ہے مگر ایک ماہر طبیب جانتا ہے کہ یہ سب علامات جو بظاہر مختلف ہیں ان سب کی بنیاد ایک ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تمام انقلابات میں بھی درحقیقت تمام ناراضگیاں آخرکار ایک ناراضگی پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں اور تمام مقاصد ایک ہی مقصد پر منتہی ہوتے ہیں کہ تمام انقلابات عالم حقیقت میں اغنیا کے خلاف محرومیوں کے انقلاب ہیں اور ان تمام انقلابوں کی بنیاد آخر میں ''محرومیت'' ہی ہے۔[1]

ہمارے دور میں۔ انقلابات کے طبقاتی مفہوم پر ہی انحصار کرنے کا خاصا رواج ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ جو بھی اسلامی موضوعات کی بات کرتا ہے یا اسلامی ثقافت کا دم بھرتا ہے وہ بھی محروم و مستضعف لوگوں، انہیں محروم و مستضعف بنائے جانے اور ان کے محروم و مستضعف ہو جانے کی اصطلاحات پر خوب زور دیتا ہے۔ اتنا کہ یہ افراط ایک طرح کی تحریف وانحراف کی جانب چلا جاتا ہے۔

---

[1] البتہ یہ نکتہ کہ محرومیت خود بھی عوامل پیدائش کی ترقی کا نتیجہ ہے اور خلیج کو وسیع کرتی ہے۔ بجائے خود قابل تحقیق ہے۔

اس کے برعکس دوسرے نظریئے کے ماننے والے کہتے ہیں کہ ہر انقلاب کی بنیاد صرف مادیت پر ہی نہیں ہوتی البتہ یہ ممکن ہے وہ کسی قدر اقتصادی اور مادی لحاظ سے معاشرے کی دوقطبیت (POLARISATION) پر بھی استوار ہو اور جناب امیرؑ کے اس خطبے کے مطابق جو آپ نے آغاز خلافت میں ارشاد فرمایا:

لولا حضور الحاضر، وقیام الحجة بوجود الناصر، وما اخذالله علی العلماء ان لایقاروا علی کظة ظالم ولاسغب مظلوم۔ [1]

امام علیہ السلام کا کظه ظالم۔ظالم کی سیر شکمی اور سغب مظلوم۔مظلوم کا بھوکا رہنا کے حوالے سے بیان کر رہے ہیں یعنی معاشرے کا دوقطبی ہو جانا اور اس کا دو دائروں میں تقسیم ہو جانا ایک چند شکم سیر افراد کا اور دوسرا خالی شکم اکثریت کا۔ایک وہ سیر شکم جو پرخوری کی وجہ سے بدہضمی کا شکار ہے اور دوسرا وہ بھوکا کہ محرومیت کے مارے جس کا پیٹ کمر سے چپک کر رہ گیا ہے۔

انقلاب کے بارے میں دوسرے نظریئے کے مطابق معاشرے کی اقتصادی اور سماجی لحاظ سے دوقطبوں یعنی محروم وخوشحالی طبقوں میں تقسیم کی شرط ضروری نہیں۔ بلکہ بسا اوقات ممکن ہے کہ کوئی انقلاب محض انسانی فطرت پر ہی مبنی ہو۔بغاوت بھوک کے مارے انسان ہی سے مخصوص نہیں، حیوان بھی اگر بہت بھوکا ہو تو اکثر وہ بھی دوسرے انسان یا حیوان یا اپنے مالک کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے۔ بہت سے انقلابات صرف انسانی فطرت کے لحاظ سے ہی برپا ہوتے ہیں۔انقلاب اس وقت انسانی ہوتا ہے جب وہ آزادی پسند نوعیت رکھتا ہو یا سیاسی نوعیت کا حامل نہ ہو کہ محض اقتصادی نوعیت کا۔ممکن ہے کہ ایک معاشرہ اپنے عوام کو شکم سیر کر دے۔ان کی بھوک کو قدرے یا بالکل مٹا دے لیکن انہیں

---

[1] ترجمہ، اگر یہ انبوہ کثیر حاضر نہ ہوتا اور مددگاروں کے موجود ہونے سے حجت تمام نہ ہو جاتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو خدا نے اہل علم سے لیا ہے کہ وہ ظالم کی سیر شکمی اور مظلوم کے بھوکے رہنے پر رضامند نہ ہوں۔

آزادی کا حق نہ دے یا اپنے مقدر میں دخل دینے اور اظہار رائے کا حق ان سے چھین لے۔ ہمیں معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ اقتصادی معاملے کا نہیں ہے لیکن ایسے معاشرے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عوام ان چھنے ہوئے حقوق کی بازیابی کے لئے آمادہ بغاوت ہوجاتے ہیں اور انقلاب برپا کرڈالتے ہیں۔ یوں وہ اقتصادی نوعیت کا نہیں بلکہ صرف جمہوری اور لبرل نوعیت کا ایک انقلاب وجود میں لے آتے ہیں۔

ان دوقسم کی نوعیتوں کے علاوہ انقلاب نظریاتی اور آئیڈیالوجیکل نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے یعنی جو لوگ ایک نظریئے پر ایمان واعتقاد رکھتے ہیں اور اس کی روحانی اقدار سے خوب وابستہ ہوتے ہیں جب اپنے مکتب فکر یا نظریئے اور مذہب کو خطرے میں دیکھتے ہیں یا اس کی بنیادوں کو کسی حملے کی زد میں پاتے ہیں تو وہ اپنے مکتب فکر پر وارد ہونے والے خطرات کے احساس سے مشتعل ہوجاتے ہیں اور اسے نقصان سے محفوظ رکھنے کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے انقلاب کا سیر شکم یا بھوکے ہونے یا سیاسی آزادیوں کے حصول، عدم حصول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ان کی خواہش اور مقصد صرف اس مکتب فکر کا تحفظ ہوتا ہے جسے وہ معرض خطر میں نہیں دیکھ سکتے اور اس کے لئے آمادہ بغاوت ہوجاتے ہیں۔

اگر ہم عوامل انقلاب کی درجہ بندی کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ یا تو وہ عامل اقتصادی اور مادی نوعیت کا ہوگا یعنی معاشرے کے دوقطبی ہوجانے اور محروم وخوشحال طبقات میں تقسیم ہوجانے کے سبب انقلاب برپا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب کا مقصد صرف معاشرے میں اس طبقاتی خلیج کو پاٹنا ہی ہے۔

دوسرا عامل خود انسان کی آزادی پسند فطرت کا وجود ہے۔ انسانی اعلیٰ اقدار میں ایک یہی قدر آزادی پسندتو ہے جو اس کو تمام مادی اقدار سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ [1]

''آئینہ دانشوران'' میں لکھا ہے کہ جب بوعلی سینا ریاست میں ہمدان کی

---

[1] مگر یہ اس شرط سے مشروط ہے کہ انقلاب انسانی پہلوؤں سے عاری اور صرف انتقام کی خاطر نہ ہو۔

وزارت پر فائز تھے۔[1] تو ایک دن وزارت کے طمطراق کے ساتھ کسی راستے سے گزر رہے تھے۔ اچانک دیکھا کہ ایک خاکروب دیوار کے قریب بنا ہوا گندے پانی کا گٹر صاف کررہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ شعر گنگنا رہا تھا۔

گرامی داشتم اے نفس از آنت
کہ آسان بگذرد بردل جہانت

اے جان! میں تیرا بہت احترام کرتا ہوں تاکہ تو دنیا کے دل سے آسانی سے گزر جائے)۔

بوعلی سینا خاکروب کی وضع قطع اور اس پر شعرخوانی دیکھ کر ہنسے، سوچا کہ یہ شخص اتنا پست پیشہ اختیار کرنے کے باوجود کیسے اپنی جان پر احسان کر رہا ہے کہ اس کا احترام کرتا ہے۔ حکم دیا کہ خاکروب کو حاضر کیا جائے اور طنزاً کہنے لگا: واقعی دنیا میں تجھ سا کوئی بھی نہیں جو اپنی جان کا احترام کرتا ہو!! خاکروب نے بوعلی کے لباس وزارت پر ایک نگاہ ڈالی اور یہ اندازہ کرکے کہ یہ وزیر ہے، جواب دیا کہ میرا پیشہ اپنی تمام تر پستی کے باوجود آپ کے پیشے سے افضل ہے کیونکہ آپ کو ناچار روز بادشاہ کے حضور جانا پڑتا ہے تاکہ اس کے سامنے حاضر ہوکر اور حد رکوع تک جھک کر کورنش بجالائیں جبکہ میں آزاد ہوں اور کسی کی بندگی کا حاجت مند نہیں۔ لکھا ہے کہ بوعلی شرمندہ ہوکر چل دیئے۔

جو بات خاکروب کی زبان پر آئی وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ یہ انسان کی آزادی پسندی ہی کی فطرت ہے جو ایک خاکروب کو ایک جابر یا ایک بادشاہ یا خود جیسے ایک انسان کے آگے جھکنے سے باز رکھتی اور اسے آزادی پر ابھارتی

---

[1] بوعلی سینا میں اپنی تمام تر دانائی اور حکمت کے باوجود دو بڑے عیب تھے، افسوس ہے کہ یہ عیب ان کی زبردست صلاحیتوں کے اظہار میں خاصے مانع رہے۔ بعد کے حکما نے بھی افسوس کے ساتھ ان کو بیان کیا ہے ایک عیب تو لذت پسندی اور دوسرا جاہ طلبی تھا اور ان دونوں نے انہیں مسائل علمی میں کامل مشغولیت سے باز رکھا نیز ان کی پیش از وقت موت کا سبب بنے۔

ہے۔خواہ اس عمل کا کچھ بھی مادی انجام ہو۔

حیوان اس لحاظ سے ہٹ کر دوسرے نقطے پر ہے کہ اسے تو یہ مسئلہ درپیش ہی نہیں اس کوتو صرف اپنا پیٹ بھرنے کی فکر ہےاور بس۔جبکہ انسان آزادی کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔

یوں یہ بات عین فطری ہے کہ کسی قوم کی تحریک کے عوامل سیاسی ہوں نہ کہ اقتصادی یا مادی، مثال کےطور پر انقلاب فرانس اسی قسم کا انقلاب ہے روسو جیسے دانشوروں اورفلسفیوں نے آزادی اوراحترام انسانیت کا خوب پر چار کر کے بغاوت کے لئے زمین ہموار کردی اور جب لوگ بیدار ہو گئے تو انہوں نے حصول آزادی کے لئے انقلاب برپا کر دیا۔

تیسرا عامل، نظریہ اور مقصدیت ہے۔ اصطلاح میں اس کی بنیاد پر استوار انقلاب کوآئیڈیالوجیکل یا نظریاتی کہا جاتا ہے۔ایسے انقلاب نظریات کی جنگ ہوتے ہیں نہ کہ اقتصادیات کی۔ دینی جنگیں ایسے نظریات کی صحیح مثال ہیں۔ جونظریئے اور مقصد کی خاطر سر کیے گئے۔قرآن بھی اس نکتے کا حامی ہے۔سورہ آل عمران کی تیرھویں آیت میں ایک دلچسپ نکتہ ہے یہ آیت غزوہ بدر میں کفار سے مسلمانوں کے مقابلے کے بارے میں ہے جب آیت مومنوں کا ذکر کرتی ہےتو ان کی جنگ کونظریاتی اورآئیڈیالوجیکل جنگ قرار دیتی ہے اس کے برعکس کافروں کی جنگ کونظریاتی قرارنہیں دیتی۔آیت مجیدہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

قَدۡ كَانَ لَكُمۡ اٰيَةٌ فِىۡ فِئَتَيۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاُخۡرٰى كَافِرَةٌ ۔[1]

ان دوگروہوں کے برسرپیکار ہونے میں تمہارے لئے ایک نشانی اورعبرت ہے۔ایک گروہ تو خدا کے راستے میں یعنی اپنے نظریئے اور ایمان کی خاطر جنگ کرتا ہے لیکن دوسرا اگروہ تو بس کافر ہے۔! آیت یہ نہیں کہتی کہ دوسرا گروہ بھی نظریئے کے لئے لڑ رہا ہے کیونکہ اس کی جنگ حقیقتاً ایمانی نوعیت کی حامل نہیں ہے ابوسفیان جیسے لوگوں کا بتوں کی

---

[1] سورۂ آلِ عمران: ۱۳

حمایت کرنا اصل میں بتوں پر ان کے اعتقاد کی دلیل نہیں تھا، بلکہ ابوسفیان جانتا تھا کہ اگر نیا نظام قائم ہو گیا تو اس کی قدرت وشوکت باقی نہیں رہے گی وہ درحقیقت اپنے مفادات کا دفاع کر رہا تھا نہ کہ اپنے نظریئے اور ایمان کا۔

اب ہماری تحریک کو اس سوال کا سامنا ہے کہ بنیادی طور پر انقلاب ایران کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ طبقاتی نوعیت کا ہے؟ یا لیبرلی نوعیت کا؟ یا کیا آئیڈیالوجیکل، نظریاتی اور اسلامی نوعیت کا حامل ہے؟ جو لوگ تمام انقلابات کے لئے فقط طبقاتی اور مادی نوعیت کے قائل ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انقلاب ایران درحقیقت محرومین کا خوشحال طبقے کے خلاف انقلاب ہے۔ گویا ایران میں دو طبقے باہم مقابل، صف آراء ہیں۔ طبقہ اغنیاء اور طبقہ فقراء اور ان کے خیال میں اگر یہ انقلاب اپنی بقا چاہتا ہے تو اسے اسی راہ پر گامزن رہنا چاہئے۔

وہ لوگ بھی جو کہ خود کو مسلمان گردانتے ہیں مگر ان کی طرح ہی سوچتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ مسئلے کو اسلامی رنگ دیں، یہ کہتے ہیں کہ بحکم آیت قرآن،

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ۝۵ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ۝۶ [1]

اسلام بھی تاریخ کی تعبیر معاشروں کے دو قطبی ہونے اور استضعاف گر اور مستضعف کے درمیان جنگ نیز استضعاف گروں پر مستضعفین کی فتح کی بنیاد پر کرتا ہے اور یہ انقلاب بھی اس کا ایک نمونہ ہے۔

لیکن قرآن میں ایک اور اہم نکتہ موجود ہے جس سے یہ حضرات غافل ہیں اور وہ یہ ہے کہ اسلام الٰہی تحریکوں کا رخ مستضعفین کے مفاد کی جانب رکھتا ہے لیکن ہر تحریک اور ہر انقلاب کی بنیاد اور محرک صرف مستضعفین کو ہی قرار نہیں دیتا۔ یعنی مادی مکتب فکر کے

[1] سورۂ القصص: ۵،۶

برعکس جو کہتا ہے کہ تحریک صرف اور صرف بدوش محرومین ہے اور صرف انہی کے فائدے کے لئے خوشحال لوگوں کے خلاف ہے اسلام انبیاء کی تحریک کو محرومین کے فائدے میں تو سمجھتا ہے مگر اسے صرف محرومین پر ہی منحصر نہیں کرتا۔ انقلاب کے رخ اور اس کی بنیاد کے درمیان اس فرق کو نہ سمجھنا ہی بہت سی غلط فہمیوں کا سبب بنتا ہے۔

جو لوگ انقلاب میں مادی عوامل کو ہی دخیل اور موثر سمجھتے ہیں وہ انقلابات کو بذاتہ سماجی ہی قرار دیتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ انقلاب کی بنیاد انسان نہیں بلکہ سماجی تبدیلیاں ہوتی ہیں جبکہ اس کے برعکس اسلام فطرت کے مطابق انسان اور انسانیت پر ہی دارومدار رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام صرف محرومین کو ہی اپنا مخاطب قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے مخاطب انسانوں کے تمام گروہ اور سماجی طبقات ہیں حتیٰ کہ خوشحال اور استضعاف گر طبقوں کی جانب بھی اس کا خطاب ہے کیونکہ اسلام کے آفاقی نقطہ نظر سے ہر استحصالی شخص اور فرعون میں بھی ایک انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے فرعون نے نہ صرف بنی اسرائیل کو ہی زنجیروں میں جکڑا تھا بلکہ اپنے اندر کے انسان کو بھی زنجیریں پہنا دیں تھیں، وہ انسان جو کہ فطرت الٰہی کا حامل ہے اور الٰہی اقدار کا پیرو ہے اس بیرونی فرعون کے قید خانے میں ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبروں نے اپنی دعوت کے آغاز میں اور طاغوتوں سے مقابلے کے شروع ہی میں سب سے پہلے اسی انسان کی طرف رخ کیا جو ان فرعونوں کے اندر مقید تھا، اس ارادے سے کہ اس انسان کو حاکم فرعون کے خلاف ابھاریں تا کہ اس طرح اندر سے انقلاب پیدا ہو سکے۔ البتہ اس معاملے میں کامیابی اسی قدر ہوگی جس قدر ہر شخص کا اندر کا انسان آزاد ہوتا جائے گا۔

اس قسم کے اندرونی انقلابات کے بارے میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ [1]

وہ کہتا ہے کہ اسی گروہ فرعون سے ایک انسان، انہی لوگوں میں

---

[1] سورۂ غافر:۲۸

سے جو کہ حاکم فرعونوں کے ساتھ کامل خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اسی طبقے سے جو کہ استحصال کنندہ اور استضعاف گر ہے اور فرعونوں کا ساتھی، رفیق اور ہم فکر ہے، ایسے ہی لوگوں میں سے ایک شخص نکل آتا ہے جو حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آتا ہے اور ان کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

زوجہ فرعون بھی ایسے ہی لوگوں میں ہے وہ حکمران طبقے میں شمار ہوتے ہیں لیکن حق کی گفتگو سن کر ان کا وجدان بیدار ہو جاتا ہے اور وہ حق کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔ زوجہ فرعون حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو قبول کر کے فرعون کے خلاف بغاوت کرتی ہے وہ سب سے پہلے اس انسان کے پاؤں کی زنجیر توڑتی ہے جو اس کے اندر پابند سلاسل ہے۔ اپنے اندر کے انسان کو آزاد کرنے کے بعد وہ فرعون کے خلاف جو اس کا شوہر بھی ہے اور ظلم و جور کے نظام کا سمبل بھی بغاوت کر دیتی ہے۔

یہ بغاوت و انقلاب قبطیوں [1] کے ایک فرد کا سبطیوں [2] کے فائدے میں تھا۔ سبطی وہ انسان تھے جو کہ دوسرے انسانوں......قبطیوں......کی جانب سے زنجیر پہنائے گئے تھے۔ لیکن ان کے اندر کے انسان نے زنجیر نہیں پہنی تھی یا کم ہی اسیر ہوا تھا۔ فطرتاً حضرت موسیٰ کی دعوت کو انہی لوگوں۔.....سبطیوں.....میں جو کہ معاشرے کے محرومین میں شمار ہوتے تھے زیادہ تر قبولیت حاصل ہوئی جس طرح رسول اکرمؐ کی دعوت کو زیادہ تر محرومین کی جانب سے ہی قبول کیا گیا تھا اور خوشحال طبقے نے کم ہی اسے لبیک کہا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی انقلاب اسلامی کو محرومین نے زیادہ قبول کیا ہے کیونکہ یہ انقلاب مستضعفین کے فائدے اور ان کی بھلائی یعنی عدل کی جانب رخ کئے ہوئے ہے۔ فطرتاً

---

[1] قبطی (الاقباط) یہ مصر کے اصلی باشندے ہیں اس نسل کے باقی افراد جو اب مصر میں رہتے ہیں وہ عیسائی ہیں (مترجم)۔

[2] سبطی (الاسباط (اہل یہود میں حضرت یعقوب کے بیٹوں کی اولاد یعنی بنی اسرائیل (مترجم)۔

چونکہ اس کا رخ عدل قائم کرنے کی طرف ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان نعمتوں کو جو چند ہاتھوں میں مرتکز ہوگئی ہیں ان سے لے کر محرومین کے اختیار میں دے دیا جائے ظاہر ہے کہ جسے حق ملے گا اس کے لئے یہ معاملہ دلچسپ اور قابل قبول ہے۔ یعنی اس کی فطرت کا جواب بھی ہے اور اسے کچھ حاصل بھی ہوتا ہے۔ لیکن جسے نعمت ترک کرنا پڑ رہی ہے۔ یہ بھی فطرت کا جواب ہے مگر اس کے لئے اس کو اپنی طمع پر پاؤں رکھنا پڑے گا۔ یوں اس شخص کے لئے نئے نظام کو قبول کرنا خاصا مشکل کام ہے اور اسی وجہ سے اس طبقے میں قبولیت کا پیمانہ کم ہے۔

ایک اور گروہ ہمارے انقلاب کی تفسیر و تحلیل کے بارے میں صرف ایک ہی عامل کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس انقلاب کی پیدائش میں صرف ایک ہی عامل کا دخل رہا ہے البتہ اس گروہ میں تین مختلف نظریات موجود ہیں۔ بعض لوگ صرف مادی و اقتصادی عامل ہی قرار دیتے ہیں۔ بعض صرف آزادی پسندی کو اور بعض صرف روحانی اور نظریاتی عامل ہی قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کے مقابلے میں ایک اور جماعت ہے جو صرف ایک عامل کی قائل نہیں بلکہ ان کے خیال میں اس انقلاب کی پیدائش اور تربیت و ترکیب میں ان تینوں عوامل کا الگ الگ عمل دخل رہا ہے اور آئندہ بھی انہی تینوں عوامل کے باہم اثر انداز رہنے سے ہی یہ جاری رہے گا اور بارآور ہوگا۔

لیکن ان نظریات کے پہلو میں ایک اور نقطہ نظر موجود ہے اور ہم بھی اس کے حامی ہیں۔ یہاں ہم کوشش کرتے ہیں کہ اس آخری نقطہ نظر کی تشریح کریں۔ بہت سوں کے اعتراف کے مطابق انقلاب ایران اپنی ذات میں ایک انوکھا انقلاب ہے یعنی اس کی نظیر دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اس انقلاب کے یگانہ ہونے کے بارے میں وہ گروہ جو کہ تین عوامل کا قائل ہے کہتا ہے ہم دنیا میں کوئی ایسا انقلاب نہیں پاتے جس میں یہ تینوں عوامل پہلو بہ پہلو حرکت کر رہے ہوں، ہم سیاسی تحریکیں پاتے ہیں مگر وہ طبقاتی نہیں ہوتیں۔ طبقاتی تحریکیں پاتے ہیں جو سیاسی نہیں ہیں اور بالآخر اگر دونوں عوامل ایک تحریک میں موجود ہوں

بھی تو وہ روحانی اور مذہبی عوامل سے خالی ہوگی۔ ویسے یہ گروہ انقلاب کے یگانہ ہونے کے بارے میں ہمارے نقطہ نظر کو ایک طرح سے قبول کرتا ہے ہمارے نقطہ نظر سے یہ انقلاب اسلامی ہے۔لیکن اسلامی ہونے سے اس کی مراد واضح ہونی چاہئے۔بعض سوچتے ہیں کہ اسلام سے مراد صرف وہ روحانیت ہے جو دوسرے دینوں کی طرح مجموعی طور پر اسلام میں موجود ہے۔ایک اور گروہ اسلامی ہونے کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ یہ بس مذہبی رسومات ادا کرنے کے اور شرعی عبادات انجام دینے کے معنی میں ہے لیکن ان تعبیروں کے باوجود ہم پر کم از کم یہ روشن ہے کہ اسلام محض وہ روحانیت نہیں ہے جیسی کہ اہل مغرب مذہب کے بارے میں سمجھتے ہیں۔ یہ حقیقت نہ صرف موجودہ انقلاب پر بلکہ صدر اسلام کے انقلاب پر بھی صادق آتی ہے۔

صدر اسلام کا انقلاب جس طرح ایک مذہبی اور اسلامی انقلاب تھا اسی طرح ایک سیاسی انقلاب بھی تھا اور جس طرح ایک روحانی و سیاسی انقلاب تھا اسی طرح ایک اقتصادی و مادی انقلاب بھی تھا یعنی حریت، آزادی اور عدل کا ہونا اور سماجی وطبقاتی خلیج کا نہ ہونا اسلامی تعلیمات کا اہم متن ہے۔ درحقیقت ان مندرجہ بالا پہلوؤں میں سے کوئی بھی اسلام سے باہر نہیں ہے۔ ہماری تحریک کی کامیابی کا راز بھی اسی میں ہے کہ اس نے صرف روحانی عوامل پر ہی انحصار نہیں کیا بلکہ دیگر مادی وسیاسی عوامل کو بھی اسلامی حدود کے ساتھ اپنے اندر سمیٹا، مثلاً طبقاتی خلیج کو پاٹنے کی جدوجہد اسلامی تعلیمات میں شمار ہوتی ہے لیکن یہ جدوجہد ایک گہری روحانیت کے ساتھ ہوتی ہے۔

دوسری جانب تمام اسلامی احکامات میں آزادی و حریت کی روح نظر آتی ہے تاریخ اسلام میں ایسے مظاہر نظر آتے ہیں گویا وہ سترھویں صدی یعنی انقلاب فرانس کے زمانے میں اور بیسویں صدی کے آزادی کے مختلف مکاتب فکر سے متعلق ہوں۔

وہ قصہ جو جارج جرداق نے خلیفہ دوم کے بارے میں نقل کیا ہے اور اس کا امیر المومنینؑ کے کلام سے تقابل بھی کیا ہے اس بارے میں بہترین مثال ہے۔ مشہور ہے کہ جب

عمرو بن عاص مصر کا حاکم تھا ایک روز اس کے بیٹے کا رعایا میں سے کسی کے لڑکے سے تنازعہ ہوگیا۔ اس تنازعے میں عمرو بن عاص کے بیٹے نے اس لڑکے کو زبردست تھپڑ رسید کیا وہ لڑکا اور اس کا باپ عمرو بن عاص کے پاس شکایت لے کر پہنچے۔ اس شخص نے کہا کہ آپ کے بیٹے نے میرے لڑکے کے تھپڑ مارا ہے میں چاہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کے مطابق اس کا بدلہ لیا جائے۔ عمرو بن عاص نے اس کی بات کو قابل اعتنا ہی نہ جانا اور دونوں کو محل سے نکال باہر کیا۔ وہ باحمیت شخص بیٹے کو لے کر مدینے کی جانب چل دیا اور سیدھا خلیفہ دوم کے سامنے حاضر ہوگیا۔ وہاں شکایت کی کہ یہ کیا عدل اسلامی ہے کہ پسر حاکم میرے بیٹے کو تھپڑ رسید کرنے اور میرا حق انصاف بھی چھین لے۔ حضرت عمرؓ نے عمرو بن عاص اور اس کے بیٹے کے حاضر کئے جانے کا حکم جاری کر دیا اور پھر اس شخص کے بیٹے کو اپنے سامنے پسر عمرو بن عاص سے بدلہ لینے کی اجازت دی اور اس وقت عمرو بن عاص کی طرف رخ کر کے کہا:

متی استعبدتم الناس
وقد ولدتهم امهاتهم احرارا

تم نے کب سے لوگوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے جبکہ آزاد ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا۔

انقلاب فرانس سے تقابل کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل اسی طرح کا اندازفکر اس انقلاب کی روح تھا یہ اعتقاد کہ جو بھی آزاد ماں سے پیدا ہوتا ہے وہ آزاد ہوتا ہے، انقلاب فرانس کا بنیادی اصول شمار ہوتا ہے۔ پھر ہم تاریخ اسلام میں دیکھتے ہیں کہ جب صدر اسلام کے مجاہدین قادسیہ [1] میں سپہ سالار ایران رستم فرخ زاد کے لشکر کے مقابل صف آراء تھے پہلی شب رستم نے لشکر اسلام کے کمانداز زہرہ بن عبداللہ کو اپنے پاس

---

[1] قادسیہ ایک مقام ہے جو کوفے سے نوے کلومیٹر کے فاصلے پر ہے یہاں چودہ ہجری میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان جنگ ہوئی تھی جو چار روز جاری رہی تھی اور مسلمانوں کو اس میں فتح ہوئی تھی۔ (مترجم)۔

بلایا اور اسے صلح کی پیشکش کی۔ اس طرح کہ مال لے لیں اور واپس پلٹ جائیں۔ اس قصے کو ہم نے اپنی کتاب ''سچوں کی داستان''[1] میں بیان کیا ہے یہاں ہم اس کا وہ حصہ پیش کرتے ہیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔

''رستم نے اپنے مخصوص غرور کے ساتھ کہا کہ تم ہمارے ہمسائے ہو، ہم تمہارے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے ہیں، تم بھی ہمارے انعامات سے بہرہ اندوز ہوتے رہے ہو اور جب بھی تمہیں کوئی خطرہ درپیش ہوا تو ہم تمہارے تحفظ کے لئے پہنچے، تاریخ میری باتوں کی گواہ ہے۔''

جب رستم کی گفتگو یہاں تک پہنچی تو زہرہ نے کہا: ''تم نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے مگر تمہیں جان لینا چاہئے کہ آج کا دن گذشتہ سے مختلف ہے۔

اب ہم وہ لوگ نہیں ہیں جو دنیا و مادیت کے طلب گار رہے ہیں۔ ہم مقاصد دنیاوی سے برگشتہ ہو چکے ہیں اور اب صرف مقاصد اخروی ہی ہمارے پیش نظر ہیں۔''

رستم نے زہرہ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے مقاصد اور دین کے بارے میں کچھ وضاحت کرے۔ زہرہ نے یوں بیان کیا:

''اس کی بنیاد و اساس دو چیزیں ہیں، خدا کی وحدانیت اور رسالت محمدؐ کی گواہی دینا اور اس بات کی کہ جو کچھ حضورؐ نے فرمایا وہ سب منجانب خدا ہے۔'' رستم نے کہا اس میں تو کوئی برائی نہیں! مزید اور کیا؟ دوسرے بندگان خدا کو اپنے جیسے انسانوں کی غلامی سے آزاد کرنا[2] اور یہ اعتقاد کرنا کہ تمام لوگ ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ سب آدم وحوا کی اولاد ہیں اس لئے ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں۔''[3]

---

[1] کتاب ''داستان راستان'' جلد دوم ص ۱۳۲، ''داستان ۱۰۸ یہ کتاب یونیسکو کے عالمی ادارے سے انعام یافتہ ہے۔ (مترجم)۔

[2] واخراج العباد من عبادة العباد الی عبادة الله

[3] الناس بنو آدم وحوا اخوة الاب وام

پھر زہرہ نے تمام مقاصد کی تشریح کی۔اس قصے کا ذکر کرنے سے میری غرض اس نکتے کی نشاندہی ہے کہ لبرلی تعلیمات (آزاد پسندی کی) اسلامی تعلیمات کی عبادات میں موجود ہیں۔[1] اقدار انسان کا یہ عظیم خزانہ جو اسلامی معارف میں موجود رہا ہے تقریباً ۲۰ ہجری شمسی) ۱۳۲۰ ھ ش) کے بعد سے ایک صحیح اور حقیقی اسلام شناس گروہ کے ذریعے ایران میں لوگوں کی خود آگاہی کا سبب بنا یعنی لوگوں کو بتایا گیا کہ اسلام دین عدل ہے، اسلام طبقاتی تفریق کا مخالف ہے، اسلام دین حریت و آزادی ہے وغیرہ۔ یوں روحانیت کے علاوہ عدل، آزادی اور مساوات جیسے دیگر مفاہیم اور مقاصد بھی اسلامی رنگ میں پیش کئے گئے جو لوگوں کے ذہن میں جگہ پا گئے۔ان مقاصد کا عوام کے ذہن نشین ہونا ہی اس بات کا سبب ہوا کہ ہماری یہ تحریک ایک ہمہ گیر تحریک بن گئی۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ اس

---

[1] اس بارے میں دوسری مثال امیر المومنین کا وہ جملہ بھی ہوسکتا ہے جو آپؑ نے امام حسینؑ کو وصیت کرتے ہوئے بیان فرمایا ''ولا تکن عبد غیرك وقد جعلك الله حرا (ہرگز کسی کا غلام نہ بن کیونکہ اللہ نے تجھے آزاد بنایا ہے)۔

والئ مصر مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں جناب امیرؑ ارشاد فرماتے ہیں '': دل کو عوام کی محبت پر مائل کر، ان سے مہربانی سے پیش آ اور نرمی کا سلوک کر نہ کہ ان کا خون نچوڑنے والا درندہ بن جائے۔عوام دو طرح کے ہیں یا تو دین میں تیرے بھائی ہیں یا خلقت کے لحاظ سے تجھ جیسے ہیں ان کی لغزشوں سے درگزر کر ان کی ان زیادتوں سے جو وہ عمداً یا سہواً کرگزریں اس طرح چشم پوشی کر جس طرح تو اپنے دوستوں اور عزیزوں سے کرتا ہے تاکہ خدا بھی تجھے بخشے اور تری گناہوں کی بخشش کرے۔تو ان کا سرپرست ہے اور دلی امر تیرا سرپرست ہے اور اللہ اس کا سرپرست ہے اور اس سے بالا ہے جس نے تجھے ان پر والی مقرر کیا۔ان کے معاملات تیرے سپرد کئے اور ان کی آزمائش میں ڈالا۔تو اپنے نفس کو خدا کی جنگ سے باز رکھ کیوں کہ تو اس کے عذاب کی تاب نہیں لاسکتا۔''

پھر امام فرماتے ہیں '': لوگوں کو جرات دے تجھ سے اپنا حق طلب کرسکیں اور ان کے لئے اعتراض وتنقید کا دروازہ کھلا رکھ کیونکہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے '': وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جس میں کمزوروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور طاقتوروں کے خوف سے ان کے حقوق کو واپس نہ لیا جائے۔''

تحریک کی ہمہ گیری کا انکار کیا جائے۔ تحریک مشروطیت [۱] ایک شہری تحریک تھی نہ کہ دیہی لیکن یہ تحریک دیہی بھی ہے اور شہری بھی، شہری و دیہاتی، نادار و مالدار، مزدور و مزارع، تاجر وغیرہ تاجر اور دانشور و عامی سب کے سب اس تحریک میں شریک ہوئے ہیں یوں تحریک کی بنیاد کے اسلامی ہونے نے سب مختلف گروہوں کو ایک ہی صف اور ایک ہی راہ میں کھڑا کر دیا۔ [۲] اس ہم آہنگی سے بھی بلند یہ بات ہے کہ ہماری تحریک نے ایک اور زبردست صلاحیت حاصل کی ہے جو یہ ہے کہ مشرقی اور مغربی بلاک ہے ہماری قوم کی مرعوبیت ختم ہو گئی۔ ہماری تحریک لوگوں کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوگئی کہ تم خود ایک علیحدہ فکر اور نظریئے کے حامل ہو، تم خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکتے ہو اور خود پر ہی اعتماد و انحصار کر سکتے ہو۔

سماجی علوم کے ماہرین کے ہاں یہ مسئلہ طے ہے کہ جیسے ایک فرد کی روح ہوتی ہے اسی طرح معاشرے کی بھی روح ہوتی ہے ہر معاشرے کی ایک ثقافت ہوتی ہے جو اس کی روح کی تکوین کرتی ہے۔ اگر کوئی اس روح کی نبضیں ٹٹول سکے اور اسے زندہ کر سکے تو وہ معاشرے کے پورے جسم کو یکسر حرکت میں لا سکتا ہے۔

بہت مدت سے مشرق و مغرب میں تصادم جاری ہے خاص طور سے اس آخری صدی کے دوران اس میں خاصی شدت آئی۔ مشرق کے لوگوں نے بالعموم اور مسلمانوں نے بالخصوص خود کو مغرب کے مقابل پایا اور ان میں کمتری اور حقارت کا احساس جاگزیں ہو گیا۔ اپنی کتاب ''بیسویں صدی کی اسلامی تحریکیں'' میں میں نے یہ نکتہ عرض کیا ہے کہ ہندوستان کے سید احمد خاں یا انگریزوں کے بقول سر سید احمد خاں ابتدا ہندوستان کی اسلامی تحریک کے زعماء میں سے تھے اور عوام کو انگریزی استعمار کے خلاف متحرک کر رہے تھے۔ انگریزوں

---

[۱] آئینی بادشاہت کی تحریک زبردست سیاسی تحریک تھی جو ۱۳۲۴ھ ش میں چلائی گئی، لیکن بعد میں اپنے اصل راستے سے ہٹ گئی (مترجم)۔

[۲] البتہ میں یہ نہیں کہتا کہ سب کا حصہ برابر ہے یہ ممکن نہیں مگر یہ ضرور ہے کہ یہ سب گروہ ایک تحریک میں ہم آہنگ اور ہم جہت ہو گئے تھے۔

نے انہیں انگلستان آنے کی دعوت دی۔ سید احمد خاں نے جب یورپ میں بیسوی صدی کے آغاز کی عظیم تہذیب اور برطانیہ عظمٰی کے پر شکوہ حالات کو دیکھا تو حواس باختہ ہو گئے۔ اور جب ہندوستان واپس آئے تو ان کے تمام افکار بدل گئے اور لوگوں کو کہنے لگے کہ ہمارے لئے انگلستان کی زیر حفاظت رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں یہ ایسی ہی فکر ہے جیسی ہمارے ہاں تقی زادہ نے پیدا کی۔

تقی زادہ کہتا ہے کہ ایرانی اگر سعادت چاہتا ہے تو اسے سر سے پاؤں تک انگریز بن جانا چاہئے ان کے مقابلے میں سید جمال الدین افغانی [۱] اسد آبادی جو باوجود یکہ سو سال سے مسلمانوں کے زبردست زوال کے دور میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب مغرب (یورپ) گئے تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ ملت مشرق کو بیدار کرنا چاہئے۔ اس کو اپنے تشخص سے آگاہ کرنا چاہئے اور مغرب کو اس کے مقابلے میں حقیر ثابت کرنا چاہئے۔ سید جمال الدین اسد آبادی نے خود اس کام کے لئے کمر ہمت کسی۔ انہوں نے اپنے رسالے (العروۃ الوثقیٰ) میں جسے وہ پیرس سے شائع کرتے تھے ''مہمان کش مسجد'' کی داستان، شائع کی تھی جو خاصی دلچسپ داستان ہے۔ [۲]

اس مہمان کش مسجد کا خلاصہ جو کہ مثنوی (مولوی رومی) میں بھی آئی ہے یوں ہے: ہم جانتے ہیں کہ قدیم زمانے میں مہمان خانے اور ہوٹل جیسی چیزیں نہ تھیں اور اگر کوئی کہیں جاتا اور وہاں اس کا کوئی دوست یا آشنا نہ ہوتا تو وہ مسجد میں چلا جاتا اور وہیں رہ لیتا۔

---

[۱] یہ اپنے زمانے کے اسلامی فلسفی اور مجاہد علما میں سے ہیں ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے اور مشرق و مغرب میں گھومے اور وحدت اسلامی اور ایک متحدہ اسلامی ریاست کی دعوت دی اپنے ساتھی شیخ محمد عبدہ کے ہمراہ پیرس سے رسالہ ''العروۃ الوثقیٰ'' جاری کیا ان کی کتاب '' دھریوں کے مذہب کا ابطال اور ان کے مفاسد کا بیان '' ہے۔ جسے شیخ محمد عبدہ نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ (مترجم)۔

[۲] مثنوی کی اس داستان کو پیش کرتے ہوئے سید جمال الدین افغانی نے مسجد کی بجائے معبد کا لفظ استعمال کیا وہ نہیں چاہتے تھے کہ یورپ سے نکلنے والے رسالے میں مسجد کا یوں ذکر ہو۔ العروۃ الوثقیٰ ص ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ (مترجم)۔

مسجد مہمان کش اس لئے مشہور تھی کہ جو کوئی وہاں شب بسر کرتا صبح کو اس کا جنازہ ہی برآمد ہوتا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ وجہ کیا ہے۔ایک روز ایک اجنبی اس شہر میں آیا اسے کوئی جگہ نہ ملی تو وہ اس مسجد میں سونے کو چلا گیا۔لوگوں نے سمجھایا بھی کہ اس مسجد میں نہ جا جو بھی اس مسجد میں سویا ہے زندہ نہیں اٹھا۔لیکن وہ اجنبی دلیر اور بہادر آدمی تھا۔اس نے کہا کہ میں تو خود زندگی سے بیزار ہوں اور موت سے ہرگز نہیں ڈرتا، میں جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ کیا ہوتا ہے۔ بہرحال وہ شخص مسجد میں جا سویا۔آدھی رات کو اطراف مسجد سے ہیبت ناک اور ہولناک آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ایسی ہیبت ناک آوازیں کہ شیر کا پتہ پانی ہو جائے۔وہ شخص آواز سن کر اٹھا اور چلایا کہ جو کوئی بھی ہے سامنے آئے میں موت سے نہیں ڈرتا۔میں تو اس زندگی سے بیزار ہوں آ اور جو تیرا دل چاہے وہ کر۔اس شخص کی پکار پر ایک خوفناک آواز بلند ہوئی۔مسجد کی دیواریں گر گئیں اور مسجد کے خزانے ظاہر ہو گئے۔'' سید جمال الدین اپنے مقالے کے آخر میں لکھتے ہیں:

''برطانیہ عظمیٰ اس قسم کا ایک بڑا معبد ہے جو گمراہ سیاسی تاریکی سے ڈرتے ہیں وہ اس میں پناہ حاصل کرتے ہیں اور خوفناک وہم انہیں مرعوب کرتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جس روز کوئی زندگی سے بیزار مگر باہمت شخص اس معبد میں چلا آیا اور اس میں مایوسی کی پکار بلند کر دی تو اس کی دیواریں منہدم ہو جائیں گی۔اور یہ طلسم اعظم ٹوٹ جائے گا۔''

خود سید جمال الدین نے یہی کام کیا۔جس زمانے میں انگلستان سے مقابلے کا خیال کسی کے دماغ میں بھی نہیں آیا تھا۔اس شخص نے انگلستان کی سامراجی سیاست سے مقابلے کی صدا بلند کی اور پہلی بار لوگوں سے اس خود باختگی کی حالت کو رفع کیا اور پہلی بار امت مسلمہ کی اسلامیت پر بھروسہ کیا گیا۔سید جمال الدین تمام اسلامی اقوام کے لئے ایک تشخص کے قائل تھے۔لیکن اس کی شخصیت مجروح ہو چکی تھی، اس کو حقیر کر دیا گیا تھا۔وہ اس شخصیت اپنی شرافت، کرامت اور تاریخ کو بھول چکی تھی وہ جانتے تھے اور قائل تھے کہ شخصیت کو اپنی خودی یاد دلائی جائے۔یہی وجہ تھی کہ سید نے آغاز سلام کی تاریخ اور ثقافت

پر انحصار کیا اور اس طرح اس امت کو اپنی خودی یاد دلائی۔ اور اقوام اسلامی کو جذبہ دیا۔ البتہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ان باتوں کا زیادہ اثر نہ ہوسکا لیکن بہرحال سید نے بعد کی تبدیلیوں اور بغاوتوں کے لئے بیج بو دیا تھا اور اب ہم ان کی ریاضتوں کا پھل خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جیسا کہ دنیا کے سیاسی حالات بتا رہے ہیں۔ اب تمام اسلامی ممالک میں اسلامی تحریکیں اپنے اسلامی تشخص کی تلاش کی بنیاد پر پیدا ہو رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جن کا نام ذرائع ابلاغ میں کم ہی سننے میں آیا ہے ایسی تحریکیں پرورش پانے لگی ہیں اور جیسا کہ قرآن بتاتے ہیں یہ تحریکیں اسلامی تشخص اور ماہیت رکھتی ہیں۔ یعنی تمام غیر اسلامی اقدار کی نفی اور مستقل اسلامی اقدار کی بنیاد پر استوار ہو رہی ہیں۔

ہمارے اپنے انقلاب کے بارے میں بھی اگر یہ نظریہ درست ہے کہ یہ اسلامی ماہیت رکھتا ہے یعنی ایسا انقلاب ہے جو تمام نظریاتی، سیاسی، روحانی اور مادی پہلوؤں سے اسلامی تشخص اور روح رکھتا ہے تو اس کے تسلسل اور بار آور ہونے کے لئے بھی اسی بنیاد اور اساس کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہوگا کہ وہ انقلاب کے صحیح تشخص کے تحفظ کی کوشش کرے۔ یعنی ہمارا انقلاب بعد میں بھی اسلامی ہی رہے نہ کہ فقط آزادی پسند۔ چاہئے کہ اسلامی ہو نہ صرف روحانی یا سیاسی۔

لیکن دیکھیں یہ کیسے ثابت ہو کہ یہ انقلاب ایک اسلامی انقلاب ہے اور کسی دوسرے تشخص کا حامل نہیں۔ انقلاب کی شناخت کا ایک طریقہ اس انقلاب اور تحریک کی رہبری کے معیار کی تحقیق ہے۔

رہبری اس طرح نہیں تھی کہ کسی نے خود کو امیدوار کی حیثیت سے پیش کیا پھر لوگوں نے اسے ووٹ دیئے اور اسے رہبری کے لئے منتخب کر لیا۔ اس کے بعد اس رہبر نے عوام کے لئے راہ عمل متعین کی۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سے گروہوں نے کہ جنہیں ذمہ داری کا احساس تھا تحریک کا عہدہ سنبھالنے کی کوشش کی مگر بتدریج پیچھے رہ گئے۔ اور رہبر خود

بخود منتخب ہو گیا۔ آپ نظر میں لائیے کہ مختلف طبقوں کی کتنی تعداد مثلاً علماء۔ کتنے ہی مراجع یا غیر مراجع۔ یا غیر یا علماء اسلامی گروہ یا غیر اسلامی گروہ اس انقلاب میں شریک تھے۔ اس تحریک میں تعلیم یافتہ اور ناخواندہ افراد، طالب علم اور مزدور کاشتکار اور تاجر سب کے سب شریک ہوئے لیکن ان تمام گونا گوں افراد میں صرف ایک شخص خود بخود (آٹومیٹک طور پر) رہبر کی حیثیت سے منتخب ہوا۔ ایسا رہبر کہ جسے تمام گروہوں نے رہبر کے طور پر قبول کیا۔ لیکن کیوں؟ کیا رہبر کی صداقت کی وجہ سے بے شک یہ رہبر صداقت کا حامل ہے۔ مگر کیا صداقت صرف امام خمینی میں ہی منحصر تھی اور کوئی اور شخص صداقت کا حامل نہیں تھا؟ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں، صداقت صرف آپ ہی میں منحصر نہ تھی۔ کیا رہبر کی شجاعت کی وجہ سے؟ اور یہ کہ آپ ہی واحد بہادر شخص تھے اور آپ کے علاوہ کوئی اور صادق و بہادر نہ تھا؟ نہیں اور بھی بہت سے بہادر موجود تھے۔ کیا اس وجہ سے کہ آپ ایک قسم کی نظر بینا رکھتے تھے اور دوسرے اس سے محروم تھے؟ کیا رہبر کی قاطعیت کی وجہ سے کہ دوسرے اس سے محروم تھے؟ ہم جانتے ہیں کہ قاطعیت بھی آپ میں ہی منحصر نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمام خصوصیات آپ میں جمع تھیں لیکن ایسا نہیں کہ یہ خصوصیات دوسروں میں نہ تھیں۔ پس کیا تھا جس کی وجہ سے معاشرے نے خود بخود ان کو رہبری کے لئے منتخب کیا؟ اس سوال کا جواب ایک ایسے بنیادی سوال میں مضمر ہے جو فلسفہ تاریخ میں ابھرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا تاریخ شخصیت سازی کرتی ہے یا شخصیت تاریخ کو بناتی ہے؟ کیا تحریک رہبر بناتی ہے یا رہبر تحریک کو بناتا ہے۔ مختصراً ہم جانتے ہیں کہ اس سلسلے میں صحیح نظریہ یہ ہے کہ ان دونوں کا باہمی اثر ہے۔ یعنی ایک طرف رہبر میں خاص خصوصیات و امتیازات ضروری ہیں۔ ان شرائط و حالات کا مجموعہ فرد کو رہبری کے مقام پر پہنچاتا ہے۔ امام خمینی اس وجہ سے اس تحریک کے بلا مقابلہ اور غیر متنازعہ رہبر قرار پائے کہ ان میں ایک رہبر کی حقیقی شرائط و خصوصیات موجود ہونے کے علاوہ انہوں نے فکری و روحانی تقاضوں اور ایرانی عوام کی احتیاجات کے حوالے سے سفر کیا جبکہ دوسروں نے جو کہ رہبری تحریک کے مقام کے حصول

میں کوشاں تھے۔ اپنے سفر میں ان چیزوں کو اتنا اہم قرار نہیں دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام خمینی نے اپنی تمام تر شخصی خصوصیات و امتیازات کے باوجود معاشرے کو تحریک دینے کے لئے انہی محرکات سے استفادہ کیا ہوتا جنہیں دوسرے بھی استعمال کرتے تھے اور اگر عوام کو حرکت میں لانے کی منطق ان کی بھی دوسروں کے مشابہ ہوتی تو ممکن تھا کہ آپ معاشرے کو حرکت میں لانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ [۱]

اگر امام میں اسلامی و مذہبی رہنمائی کی صفت نہ ہوتی اگر ایران کے عوام اپنی روح کی گہرائیوں میں اسلام سے اک گونہ محبت والفت نہ رکھتے، اگر وہ عشق جو کہ ہمارے عوام کو خاندان رسولؐ سے ہے نہ ہوتا۔ اگر عوام یہ محسوس نہ کرتے کہ یہ صدائے رسولؐ صدائے علیؑ یا صدائے حسینؑ ہے جو اس شخص کے منہ سے بلند ہو رہی ہے تو ناممکن تھا کہ ہمارے ملک میں اتنی وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ ایک تحریک یا انقلاب وجود میں آتا۔

رہبر کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ وہ انقلاب کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال کر آگے بڑھے۔ آپ نے ظلم سے مقابلہ کیا مگر اسلامی معیارات کے ساتھ امام نے اس فکر کو پیش کر کے کہ ایک مسلمان کو ظلم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنا چاہئے، ایک مسلمان کو دباؤ کے سامنے نہ جھکنا چاہئے۔ اور ایک مسلمان اپنے آپ کو یہ اجازت نہ دے کہ وہ ذلیل ہو۔ مومن کو نہیں چاہیے کہ کافر کا فرمانبردار بنے۔ [۲] ظلم و ستم اور استعمار و استحصال کے خلاف جہاد کیا وہ جہاد جو پرچم اسلام کے تحت تھا اور اسلامی اقدار و معیارات کے مطابق۔

اس رہبر کے بنیادی اقدامات میں سے ایک تو سیاست سے دین کی علیحدگی کے

---

[۱] مثلاً اگر عوام کو خود آگاہی اور طبقاتی تضادات کے مسئلے یا عدل و آزادی جیسے مفاہیم کو مشرق و مغرب کے نظریات کے پیمانوں کے مطابق آپ کی جانب سے پیش کیا جاتا تو معاشرے میں وہ تابش پیدا نہ ہوتی جبکہ آپ نے اپنی مفاہیم کو اسلامی پیمانے کے مطابق اور ثمر بار اسلامی ثقافت کے حوالے سے معاشرے میں پیش کیا تو معاشرے نے بھی بڑی خوشی سے انہیں قبول کیا۔

[۲] وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ سورۂ نساء: ۱۴۱
خدا اہل ایمان پر ہرگز کافروں کے تسلط کو راہ نہیں دے گا۔

مسئلے کی طویل اور شدید مخالفت بھی شامل تھی، شاید اس معاملے میں پیش قدمی کا شرف سید جمال الدینؒ کو حاصل ہے وہ شاید پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ احساس کیا کہ اگر مسلمانوں میں کوئی تحریک پیدا کرنی ہے تو انہیں سمجھایا جائے کہ سیاست دین سے جدا نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس مسئلے کو بڑی شدت سے مسلمانوں میں پیش کیا جس کے بعد سامراجیوں نے مزید کوشش کی کہ اسلامی ممالک میں دین وسیاست کا تعلق مٹا دیں۔

ان کوششوں میں سے ایک سیکولرازم کے نظریئے کو فروغ دینا ہے جس کا مطلب سیاست سے دین کی علیحدگی ہے۔ سید جمال الدینؒ کے بعد عرب ممالک خاص کر مصر میں ایسے بہت سے افراد پیدا ہوئے جنہوں نے قومیت پر تکیہ کرتے ہوئے عرب ازم اور پان عرب ازم کی قوم پرستی کے لباس میں سیاست سے دین کی علیحدگی کے نظریئے کا پرچار کیا۔ آخر میں آپ نے بھی دیکھا کہ انور سادات نے اسی مسئلے کو پھر اچھالا ہے۔ انور سادات نے اپنی باتوں میں اس نکتہ پر خصوصی زور دیا ہے کہ دین مسجد کی چیز ہے اور چاہئے کہ اسے وہیں انجام دیا جائے اصولی طور پر مذہب کو سیاسی مسائل سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہئے۔

ہمارے معاشرے میں بھی یہ مسئلہ نہایت شدومد سے پیش کیا گیا اتنا کہ عوام نے تقریباً اسے قبول کر لیا تھا۔ لیکن ہم سب نے دیکھا کہ جب ایک مرجع تقلید کی زبان سے، اس شخص کی زبان سے کہ جس کے احکامات کے مطابق لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے مذہبی اعمال کو بھی انجام دینے کی پوری کوشش کرتے ہیں، وضاحت کے ساتھ بیان ہوا کہ دین سیاست سے جدا نہیں ہے اور اس نے لوگوں سے کہا کہ اگر تم ملک کی سیاست سے دور ہو گئے تو دین سے بھی دور ہو جاؤ گے۔ لوگ کیسے پر جوش ہو کر اٹھے اور جنگی اقدام کیا۔ ذرا دیکھئے کہ آزادی کا مسئلہ معاشرے میں کتنی شدت سے پیش ہوا لیکن اس کے باوجود لوگوں پر اثر انداز نہیں تھا لیکن جب یہی مسئلہ رہبر کی زبان سے پیش ہوا یعنی اس کی زبان سے جو دینی و مذہبی رہبر ہے عوام کو پہلی بار اندازہ ہوا کہ آزادی صرف سیاسی موضوع ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بالاتر ایک اسلامی موضوع ہے اور یہ نکتہ روشن ہوا کہ ایک مسلمان شخص کو چاہئے

کہ آزاد زندگی بسر کرے اور آزادی پسند رہے۔

گزشتہ چند سال کے دوران ایران میں ایسے مسائل پیدا ہوئے جو اقتصادی اور سیاسی پہلو سے چنداں اہمیت کے حامل نہ تھے لیکن مذہبی پہلو سے دو اہم مذہبی شعائر میں سے تھے اور خود ان مسائل نے تحریک کو عروج پر پہنچانے میں اہم کردار کیا۔ مثلاً حکومت کی بڑی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اسے خود پر جو غرور تھا اس کے سہارے اس نے ۱۳۵۵ کے آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ ہجری تقویم کو شہنشاہی تقویم میں بدلا جائے۔[۱] تقویم ہجری ہو یا شہنشاہی عوام پر اس کا کوئی سیاسی یا اقتصادی اثر تو نہیں ہوتا مگر اسی مسئلے نے ان کے مذہبی جذبات کو بڑی شدت سے مجروح کیا اور یوں رہبر کو حکومت کی سرکوبی کا ایک اور عمدہ موقع فراہم کر دیا۔ رہبر نے فوراً یہ بیان دیا کہ حکومت کا یہ فعل اسلام اور رسول اسلامؐ سے دشمنی کہ ہزاروں مسلمانوں کے قتل کے مساوی ہے اس طرح عوام میں بغاوت ابھارنے میں کامیابی حاصل کر لی اور ان کے اسلامی احساسات کو تحریک دیکر انقلاب کی رفتار کو اور زیادہ تیز کر دیا۔

رہبری کے مسئلے اور اس کی کیفیت کو سمجھنے کے بعد اور اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ عوام نے بہت سے باصلاحیت افراد کے ہوتے ہوئے اس رہبر کا انتخاب کیا۔[۲] اور اس راہ کا تجزیہ کر کے جو اس رہبر نے طے کی اور جن عوامل پر اس نے تکیہ کیا اور جس منطق کو اس نے استعمال کیا۔ ان سب امور کی تحقیق کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہماری تحریک واقعی ایک اسلامی تحریک تھی۔ باوجود یہ کہ وہ تحریک ایک طرف عدل کے لئے تھی اور

---

[۱] ایران میں سرکاری طور پر ہجری شمسی تقویم رائج تھی لیکن ۱۳۵۵ھ ش مطابق ۱۹۶۷ء میں حکومت نے ایران کے قبل از اسلام دور سے ڈھائی ہزار سالہ جشن مناتے ہوئے ہجری تقویم کو قدیم شہنشاہی تقویم سے بدلنے کا فیصلہ کیا یہ تقوی صرف دو سال ہی جاری رہی (مترجم)۔

[۲] توجہ رہے کہ رہبر نے خود کو طاقت کے بل پر عوام پر مسلط نہیں کیا تھا نہ ہی کسی شخص نے ان کو مقرر کیا تھا اور نہ انہوں نے خود کو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا تھا بلکہ ان کا انتخاب طبعی طور پر خود بخود ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف آزادی اور استقلال کے لئے مگر عدل کو اسلام کے زیرِ سایہ چاہتی تھی اور آزادی واستقلال کو اسلامی روشنی میں دیکھتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہماری تحریک ہر چیز کو اسلامی رنگ و بو میں طلب کرتی تھی۔ اس کا یہی پہلو اور یہی رخ ملت کی خواہش اور اس کی مراد تھا۔ [1]

اب میں اس نکتے کو مکمل کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف میں نے ابتدائے گفتگو میں اشارہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہر انقلاب کچھ ناراضگیوں اور بے چینیوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یعنی جب عوام موجودہ حالت سے مطمئن نہ ہوں اور ایک پسندیدہ حالت کی تمنا اور تقاضا کریں تو انقلاب کے لئے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اب میں اس موضوع کو پوری طرح بیان کرتا ہوں اور وہ یہ کہ صرف ناراضگی اور بے اطمینانی ہی کافی نہیں ممکن ہے کوئی قوم موجودہ حالت سے نامطمئن ہو اور حالت میں تبدیلی کی خواہشمند بھی مگر اس کے باوجود وہ انقلاب برپا کرنے کے لئے آمادہ نہ ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ ممکن ہے اس قوم میں مجبوراً رضا مندی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہو یا اس نے ظلم کے آگے سرِتسلیم خم کر دیا ہو۔ ایسے عوام اگرچہ ناراض ہوتے ہیں مگر پھر بھی ظلم پر شاکر ہوتے ہیں۔ اگر قوم ناراض ہو مگر موجودہ حالت سے نفرت کا جذبہ بھی رکھتی ہو اور اس میں انکار واسترداد کا جذبہ بھی ہو تو وہ انقلاب لا سکتی ہے۔

---

[1] ایک مثال بیان کروں میرا ایک دوست ہے جو ساری زندگی حکومت سے سر بر پیکار رہا اور اس کے لئے اس نے اپنی جان و مال سے بھی دریغ نہیں کیا وہ مجاہدین خلق سے اپنے تعلق کی وجہ سے جو کہ اس وقت حکومت کے مخالف تھے۔ ایک خاص رجحان کا حامل تھا۔ جب ان کی تنظیم میں موقع پرستی کا چکر چلا تو میں اس دوست کے بارے میں فکر مند رہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی اس اثر کو قبول کر لے اور کہے کہ کیا ہوا اگر یہ لوگ مارکسسٹ ہو گئے ہیں کیونکہ مقابلہ کرنا چاہئے اصل چیز تو مقابلہ ہے مگر بعد میں ایک میٹنگ میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے تنظیم کے مارکسسٹ ہو جانے کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس نے کہا'' حقیقت میں ہم عدل کو بھی خدا کے زیر سایہ طلب کرتے ہیں، اگر عدل تو بنیاد ہو مگر خدا کے نام یا اس کی یاد کا کوئی اثر نہ ہو تو ایسے عدل سے بیزار ہیں۔ '' ایسے جذبات تھے جن کی بنا پر ہماری ملت اتنا عظیم الشان انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوئی۔

یہاں آ کر مختلف مکاتب فکر کا کردار روشن ہو جاتا ہے۔ اسلام کی یہ خاصیت ہے کہ اپنے پیروکاروں کو ناپسندیدہ حالت کی نفی کرنے اور اس سے مقابلہ کرنے کا جذبہ عطا کرتا ہے۔ جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر یہ کیا ہیں؟ یہی کہ اگر موجودہ حالت ناپسندیدہ اور غیر انسانی ہوتو اس کے آگے نہ جھکو اور نہ ہی اس پر راضی ہو بلکہ اس حالت کی نفی اور انکار کے ساتھ ساتھ پسندیدہ اور مثالی حالت لانے کی بھرپور کوشش کرو۔

عیسائیت، کہ جس کی بنیاد تسلیم ورضا پر ہے، صدیوں سے اسلام پر تنقید کرتی آئی ہے کہ یہ کیسا مذہب ہے؟ دین میں تو شمشیر وجہاد نہیں ہونا چاہئے، دین کو صلح وصفائی کا دم بھرنا چاہئے، دین کو کہنا چاہئے کہ اگر کوئی تیرے دائیں گال پر طمانچہ رسید کرے تو بایاں بھی اس کی طرف کر دے۔ جبکہ اسلام کی فکر یہ نہیں ہے، اسلام کہتا ہے:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر۔ [1]

یعنی سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ انسان ظالم حکمران کے سامنے عدل کی بات کرے اور عدل کا دم بھرے میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ اس چھوٹے سے جملے نے دنیائے اسلام میں کتنی غیرت وجرات کو فروغ دیا ہے۔

اگر کسی مکتب فکر میں ظلم وستم اور دھونس کے مقابلے میں تنقید اور جہاد کا وجود ہے تو وہی مکتب فکر اپنے پیروکاروں میں انقلاب کا بیج بو سکتا ہے۔ آج خوش بدقسمتی سے بیج ہم میں پھر بو دیا گیا ہے یعنی سالوں اور صدیوں کے بعد جب کہ ہم جہاد، اور امر بالمعروف اور نہی

---

[1] سنن نسائی ۷:۱۶۱ مترجم

عن المنکر کوفراموش کر چکے تھے۔ یہ ہمیں پھر یاددلا دیا گیا ہے۔[1] اس آخری صدی میں خوش قسمتی سے یہ مسئلہ دوبارہ معاشرے میں اٹھا ہے اور اپنی جگہ بنا رہا ہے۔

لیکن اسی میں ایک اور نکتہ بھی موجود ہے جو ہمیں دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے اور وہ یہ کہ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام انقلاب سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اس کی تعلیمات میں انقلاب کا بیج ہے تو انقلابی مسلمانوں کے سامنے یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ مستقبل کا راستہ کیا ہونا چاہئے: اسلامی انقلاب یا انقلابی اسلام؟

اسلامی انقلاب، یعنی وہ راستہ جس کی منزل اسلام اور اس کی اقدار ہیں اور وہ انقلاب اور مقابلہ فقط اسلامی اقدار کو رائج کرنے کے لئے برپا کیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مقابلہ یا انقلاب اس راہ کی منزل نہیں بلکہ وسیلہ ہے مگر کچھ لوگ اسلامی انقلاب اور انقلابی اسلام میں اشتباہ کرتے ہیں یعنی ان کے نزدیک انقلاب و مقابلہ ہی منزل ہے اور اسلام اس کے لئے ایک وسیلہ۔ یہ کہتے ہیں کہ مقابلے کی راہ میں اسلام کی جو چیز مدد دے اسے قبول کرلو اور اسلام میں سے جو کچھ ہمیں مقابلے کی راہ سے روکے اسے مسترد کر دو۔ ظاہر ہے کہ اسلامی انقلاب اور انقلابی اسلام کے نتائج مختلف ہونے سے اسلام، انسان، توحید، تاریخ، معاشرہ اور آیات قرآن کی تعبیرات وتشریحات باہم متضاد ہو جاتی ہیں۔

اسلام کو منزل قرار دینے والے اور مقابلے اور جہاد کو اسلامی اقتدار کے قیام کے لئے وسیلہ قرار دینے والے شخص میں خاصا فرق ہے جو مقابلے کو ہی منزل قرار دیتا ہے اور کہتا

---

[1] مجھے یاد ہے کہ شروع میں جب انجینئروں کی انجمن اسلامی کے اجلاس ہوتے تھے تو اس وقت میں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں تحقیق کی تھی۔ اس مطالعے کے نتیجے میں مجھے ایک دلچسپ نکتہ ہاتھ آیا تھا۔ جو میرے لئے خاصا باعث تعجب تھا۔ اس سے مجھے معلوم ہوا کہ گزشتہ دوسو سال سے ہمارے رسالہ عملیہ میں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مسائل خارج کر دیئے گئے ہیں جبکہ دوسو سال قبل کے عربی وفارسی رسالہ عملیہ میں یہ مسائل نماز، روزہ، خمس، زکوٰۃ وغیرہ کے ساتھ بیان کئے گئے تھے گویا ذہنوں میں خود بخود ان مسائل کے ساتھ ساتھ جہاد ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مسائل آجاتے تھے لیکن جس طرح رسالہ عملیہ سے قصاص وغیرہ کے مسائل نکال دیئے گئے اسی طرح جہاد ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مسائل بھی خارج ہوتے گئے۔

ہے مجھے تو ہمیشہ حالت مقابلہ ہی میں رہنا چاہیے کہ اصل میں اسلام تو آیا ہی فقط مقابلے کے لئے ہے۔ اس گروہ کے جواب میں یہ کہنا چاہئے کہ تمہارے تصور کے برعکس باوجود یہ کہ اسلام میں مقابلے کا عنصر بھی موجود ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام صرف مقابلے کے لئے ہی آیا ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی اور مقصد ہی نہیں ہے، نہیں، اسلام میں بے شمار احکامات موجود ہیں اور مقابلہ ان میں سے ایک ہے۔

یہ سوچ کہ مقابلہ ہی اصل اور بنیاد ہے، اس طرز فکر کی پیداوار ہے جو مادہ پرست لوگ معاشرے اور تاریخ کے بارے میں رکھتے ہیں۔ ان کے نظریئے کے مطابق تاریخ اور فطرت اپنے دوران عمل میں........جسے وہ ڈائلکٹک کہتے ہیں........اضداد میں سے گزرتے ہیں۔ دنیا میں ہمیشہ سے اضداد کی جنگ جاری ہے اور یہ ڈائلکٹک انداز میں ہو رہی ہے یعنی فطرت و تاریخ کی ہر اکائی اپنے اندر لازمی طور پر اپنی ہی نفی کرنے والے ایک عامل کی پرورش کرتی ہے اور اس عامل کے نشوونما پا جانے پر پہلی اکائی تھیسس (THESIS)........جواب سابقہ عنصر قرار پائی ہے اور اس کی نفی کرنے والے عنصر........اینٹی تھیسس (ANTI THESIS) جواب نیا شمار ہوتا ہے کے درمیان جنگ وجدل برپا ہوتی ہے اور یہ جنگ ایک نئے عنصر کی کامیابی یعنی ایک نئی ترکیب سنتھسس (SYNTHESIS) کے بننے کی تشکیل پر منتج ہوتی ہے پھر دوبارہ یہی عمل شروع ہوتا ہے اور جنگ سے حاصل شدہ سنتھیسس بطور ایک تھیسس کے وارد عمل ہو جاتا ہے اور یوں ہر بار نیا سنتھیسس پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس طرز تفکر کی بنیاد پر فطرت، زندگی اور معاشرہ غرضیکہ ہر چیز میں ایک جنگ بپا ہے۔ انقلاب بھی ہمیشہ اپنے اندر اینٹی تھیسس رکھتے ہیں۔ یعنی ہر پہلے سے موجود چیز کا انکار، موجودہ حالت کا انکار جو بھی موجودہ حالت کے خلاف........خواہ کوئی حالت ہو........مقابلہ کرے تو ترقی پذیر اور تکمیل پذیر ہے۔ جیسے ہی نئی حالت وجود میں آتی ہے فوراً اس کے اندر ایک نئی حالت جو کہ اس کے انکار پر مبنی ہوتی ہے پیدا ہو جاتی ہے یوں ترقی پذیر انسان کو ہر پرانی چیز کو ختم کرتے رہنا

چاہئے۔مقابلہ، بنیادی طور پر ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکتا اور نہ ہی رکنا چاہئے۔ ہر لمحہ مقابلہ کی جو بھی صورت ہو حقانیت اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔اسی طرز تفکر کی بنیاد پر وہ گروہ اپنے طور پر کوشاں ہے کہ اسلام کو انقلابی کر دے........ نہ کہ انقلاب کو اسلامی بنائے........اور اسلام کا معیار سب جگہ مقابلہ ہی قرار دیتا ہے۔[۱]

اب تک جو وضاحت کی گئی ہے اس کے مطابق اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا انقلاب اسلامی ماہیت کا انقلاب ہے........البتہ اسلامی ان معنوں میں جن کی میں نے تشریح کی ہے یعنی تمام اسلامی مفاہیم، اقدار و مقاصد کا جامع اور اسلامی شکل و قالب میں، تو اس صورت میں یہ انقلاب آئندہ اس شرط پر محفوظ رہے گا اور دوام پیدا کرے گا کہ اولاً ہمیشہ عدل کو قائم رکھے، یعنی آئندہ کی حکومتیں حقیقی اور عملی طور پر عدل اسلامی کے راستے پر گامزن رہیں، طبقاتی خلیج کو پاٹنے کا اقدام کریں، تفریق کو ختم کریں اور اسلامی مفہوم کا ایک توحیدی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کریں........نہ کہ اس مفہوم کا جو دوسرے کہتے ہیں کیونکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسلامی حکومت میں کسی وجہ سے بھی کسی شخص پر ظلم نہیں ہونا چاہئے۔حتیٰ کہ اگر کوئی شخص واجب القتل مجرم بھی ہو۔ یہاں ہمیں اپنے کچھ جوان دوستوں سے شکوہ ہے باوجود یہ کہ ہمیں ان کے پاکیزہ جذبات کا اندازہ ہے مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مسائل میں ان کی جانب سے جس نقطہ نظر کا اظہار ہوتا ہے وہ احساس ظلم کا نقطہ نظر تو ہے مگر اسلامی فکر کا نقطہ نظر نہیں ہے۔ چند روز پہلے ایک موقع پر جناب مہندس بازرگان[۲] کے ہاں جانا ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ کچھ پاسدار جو وہاں آئے تھے اور وہ انقلابی عدالتوں سے جاری ہونے والی موت کی سزاؤں کی شکایت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ یہ مجرم گولی کھانے کے قابل بھی

---

[۱] اس طرز فکر یعنی انقلابی اسلام والوں اور انقلاب کے اسلامی ہونے کے معتقدین کے طرز فکر میں اتنے اختلافات ہیں کہ ان سب کا ذکر اس تقریر میں ممکن نہیں

[۲] انقلاب کے بعد ایران کا پہلا وزیر اعظم

نہیں ہیں انہیں تو زندہ ہی سمندر میں پھینک دینا چاہیئے۔

ان دوستوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلامی فکر کے مطابق اگر کسی شخص نے ہزاروں انسانوں کا قتل بھی کیا ہو اور اس کے لئے سزائے موت سو بار کم ہو پھر بھی اسے کچھ حقوق حاصل ہیں جن کا خیال رکھا جانا چاہیئے۔ اس سلسلے میں ہمیں حضرت علی کے مکتب فکر سے بہترین سبق مل سکتا ہے، آپ ان کا اپنے قاتل سے سلوک دیکھیئے، اس میں محبت، نرمی اور انسانیت کا ایک جہان موجود ہے۔ علی علیہ السلام بستر میں پڑے ہیں اور اپنے تمام اقربا یعنی بنو عبدالمطلب کو طلب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں: اے بنو عبدالمطلب! ایسا نہ ہو کہ تم میرے بعد مسلمانوں سے میرے خون کے انتقام کے لئے یوں اٹھ کھڑے ہو یہ کہہ کر کہ علیؑ مارے گئے اس لئے ہر مجرم اور مددگار اور یہ اور وہ سب کے سب قتل کر دینے چاہئیں دیکھو میں ایک ہی آدمی ہوں ابن ملجم نے مجھے ایک ہی ضرب لگائی ہے تم بھی اسے ایک ضرب سے زیادہ نہ لگانا اور ہم تاریخ میں مطالعہ کرتے ہیں کہ جتنا عرصہ ابن ملجم حضرت علیؑ کے گھر میں اسیر رہا، اس سے ذراسی بھی بدسلوکی نہیں ہوئی حتیٰ کہ حضرت اپنی غذا تک اس قیدی کے لئے بھیجتے اور وصیت فرماتے کہ ایسا نہ ہو قیدی بھوکا رہے۔

ایسا عدل ہونا چاہیئے جو ہم سب کے لئے سبق ہے۔ بیشک ایسی ہی اقدار کے وجود نے ہمارے مکتب فکر کو پورے چودہ سو سال سے محفوظ اور سرسبز وشاداب رکھا ہے۔

میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ ہمارا انقلاب عدل اجتماعی کے قیام کی راہ پر آگے نہ بڑھا تو کبھی بھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکے گا اور اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ کسی اور قسم کا انقلاب اس انقلاب کی جگہ لے لے۔ لیکن جس اہم نکتے پر توجہ دینی چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ اس انقلاب کی اساس کار اخوت اسلامی پر استوار ہونی چاہیئے یعنی جو کام دوسروں نے سختی اور دباؤ سے انجام دیا وہ یہ انقلاب روا داری، رضامندی اور بھائی چارے سے انجام دے۔ اگر ہمارے انقلاب کے تمام اجزاء واقعی اسلامی ماہیت کے حامل ہیں تو ان کی معنویت ہے یعنی عوام اپنی روحانی بلوغت، انسانی جذبے اور اسلامی اخوت کے بموجب خلیج

کو پاٹنے اور طبقاتی واقتصادی فاصلوں کوختم کرنے کے لئے خود پیشقدمی کرتے ہیں یہ وہ مکتب ہے جس کے رہنما علیؑ فرماتے تھے:

ولکن هیهات ان یغلبنی هوای، ویقودنی جشعی الی تخیر الاطعمة،ولعل بالحجاز و الیمامة من لا طمع له فی القرص ولا عهد له بالشبع اوابیت مبطانا وحولی بطون غرثی وا کباد حری۔

یہ بات دور رہے کہ ہوس مجھ پر غلبہ پائے اور لالچ مجھے کھانوں پر مائل کرے جبکہ حجاز اور یمامہ میں ایسے لوگ ہوں جنہیں روٹی کی امید نہ ہو اور نہ کبھی وہ سیر ہوئے ہوں اور یہ بھی دور رہے کہ میں شکم سیر ہو کر سوؤں جبکہ میرے گرد بھوکے اور جگر سوختہ لوگ موجود ہوں۔[1]

ہمیں حضرت علی علیہ السلام کے اسی انداز سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور دوسروں کی خاطر قربانی کا جذبہ ہم سب میں پیدا ہونا چاہئے۔آپ نے دیکھا کہ امام خمینی نے گھروں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے جنگی سطح پر اقدام کا اعلان کیا ہے کیونکہ امام چاہتے ہیں، کہ یہ اسلامی انقلاب باقی رہے اس لئے تمام مقاصد اسلامی انداز میں حاصل کئے جائیں نہ کہ ایک نئی اسلامی حکومت قائم کر دی گئی اور بس۔کام رغبت سے آگے بڑھنا چاہئے اور عدل اجتماعی پورے طور سے جاری ہونا چاہئے جبکہ عوام ایک جذبے اور لگاؤ سے اسلامی احکام کی پیروی میں اپنی صلاحیتوں کو محرومین کی بہبود کے لئے صرف کریں گے تو اس وقت ہمارا انقلاب اطمینان بخش راہ پا جائے گا۔

ہمارا انقلاب اس وقت حقیقی انقلاب ہوگا جب ہر گھرانہ یہ اطمینان کرنے سے پہلے اپنے بچوں کے لئے عید کے لئے نیا لباس تیار کرنے پر آمادہ نہ ہوگا کہ غریبوں کے گھروں میں بھی نیا لباس ہے یا نہیں یہ حدیث پیغمبرؐ ہمارا نصب العین ہونی چاہئے کہ:

---

[1] نہج البلاغہ: مکتوب ۴۵

''مومنین باہمی محبت میں ایک جسم کی مانند ہیں اگر ایک عضو کو کوئی تکلیف ہو تو جسم کے باقی اعضا بھی بے چین ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ورم اور درد و تکلیف میں شامل ہو کر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔''[۱]

ہمارا معاشرہ تب اسلامی معاشرہ ہوگا جب کسی شخص کا درد اس کا اپنا درد نہ رہے بلکہ تمام مسلمانوں کا درد ہو جائے۔ علی علیہ السلام ایسے ہی مثالی مسلمان تھے وہ فرماتے تھے:

اقنع من نفسی بان یقال ھذا امیر المومنین ولا اشارکھم فی مکارہ الدھر۔

کیا میں خود کو اسی بات پر خوش کر لوں کہ لوگ مجھے امیر المومنین کہیں جبکہ میں ان کی مصیبتوں میں شریک نہ ہوں۔[۲] امام فرماتے ہیں: القاب و خطاب کی کیا قیمت! انقلابی شخص تو بنیادی طور پر القاب و خطاب کا پابند ہی نہیں اسے نہیں چاہئے کہ وہ ان القاب سے دل خوش کرے اور عوام کی سختیوں میں شرکت نہ کرے۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں بچپن میں ایک رات میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ مادر گرامی جناب زہرا سلام اللہ علیہا نماز شب میں مصروف ہیں۔ میں نے توجہ سے سنا کہ مادر گرامی اپنی دعا میں ایک ایک مسلمان کا نام لے کر اس کے لئے دعا کر رہی ہیں۔ میں

---

[۱] امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: المومن اخ المؤمن کالجسد الواحد ان اشتکی شیئاً منہ وجد الم ذلك فی سائر جسد (الکافی: ۲۔۱٦٦)

مومن، مومن کا بھائی ہے ایک جسم کی طرح اگر ایک حصے کو تکلیف ہو تو باقی جسم بھی دکھنے لگے۔

امام محمد باقر ارشاد فرماتے ہیں۔

المومنون فی تبارھم وتراحمھم وتعاطفھم کمثل الجسد اذا اشتکی تداعی لہ سائرہ بالسھر والحمی بالسھر والحمی۔ البحار ۴: ۲۴۳

مومن آپس کی نیکی، رحمدلی اور شفقت میں جسم کی مانند ہیں اگر ایک عضو کو تکلیف ہو تو باقی جسم بھی بے خوابی اور بخار میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ (مترجم)۔

[۲] نہج البلاغہ: مکتوب ۴۵

نے سوچا دیکھوں کہ اپنے لئے کس طرح دعا فرماتی ہیں مگر اس پر بہت تعجب ہوا کہ آپؑ نے اپنے لئے اگلے روز میں نے آپؑ سے پوچھا کہ آپ نے سب کے لئے دعا فرمائی مگر اپنے لئے دعا نہ فرمائی کیوں نہ فرمائی۔ ارشاد فرمایا

یابنی الجار ثم الدار

پیارے بیٹے پہلے پڑوسی پھر گھر والے۔

ایک مقام پر ہم دیکھتے ہیں کہ جناب زہرا اسلام اللہ علیہا اپنی شب عروسی میں وہ واحد لباس جو لباس عروسی کے طور پر باپ کے گھر سے لائی ہیں ایک غریب سوالی عورت کو ہدیہ فرما دیتی ہیں۔

انقلابی جذبہ اور اسلامی اخلاق ایسا ہوتا ہے۔ ہمارا انقلاب بھی اس وقت ثمر بار ہوگا جب ہم خود کو ایسے ایثار کے لئے اپنے بھرپور ذوق وشوق سے آمادہ کرلیں گے۔

اب جبکہ اس انقلاب کی ماہیت عدل پسندی کی ہے تو ہم سب کا یہ فرض ہے کہ آزادی کا اس کی لفظی ومعنوی حقیقت کے ساتھ احترام کریں کیونکہ اگر اسلامی جمہوری حکومت قائم ہوکر دباؤ اور گھٹن کی فضا پیدا کرتی ہے تو یقیناً شکست سے دوچار ہوجائے گی [1]

اسلام دین آزادی ہے، وہ دین جو معاشرے کے تمام افراد کے لئے آزادی کو رائج کرتا ہے۔ سورہ دہر میں ہم تلاوت کرتے ہیں:

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾ [2]

---

[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی قانون کے دائرے سے باہر نہیں ہونی چاہئے، موج کو آزادیاں سامان شیون ہوگئیں

جس آزادی کا اسلام نے حکم دیا ہے وہ ایسی ہے جو معاشرتی زندگی اسلامی تعلیمات اور مسلم قوم کی حرمت کو تباہ نہ کرے جیسا کہ امام خمینی مدظلہ العالی نے فرمایا تمام پارٹیاں اپنے افکار اور مطبوعات کو پیش کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہیں لیکن ہم انہیں سازش وبربادی کی اجازت نہیں دے سکتے۔ مترجم

[2] سورۂ دھر: ۳

ہم نے انسان کو صحیح راستہ کی رہنمائی کر دی اب خواہ وہ شکر گزار
ہو یا ناشکرا

یا سورہ کہف میں ہے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [1]

جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔

اسلام کہتا ہے کہ دینداری اگر جبر کے تحت ہو تو وہ دینداری نہیں۔ لوگوں کو یہ تو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ یہ بات نہ کہو اور یہ کام نہ کرو مگر انہیں یہ مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ یوں یا ووں نہ سوچو۔ اعتقاد دلیل اور منطق کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ البتہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلقہ مسائل اپنی شرائط کے ساتھ اپنی جگہ ہیں، ایسے مسائل کی بنیاد ارشاد وہدایت ہے نہ کہ جبر۔

البتہ آزادی ہر طرح کے حرج ومرج سے پاک ہونی چاہئے اور آزادی سے ہماری مراد عقلی معنوں میں آزادی ہے۔

ہر شخص کی فکر و بیان اور اس کا قلم آزاد ہونا چاہئے۔ صرف اسی طرح ہمارا انقلاب صحیح کامیابی کے راستے پر گامزن رہے گا۔

سابقہ تجربات بتاتے ہیں کہ جب بھی معاشرہ ایک طرح کی فکری آزادی سے خواہ وہ نیک نیتی سے نہ بھی ہو۔ بہرہ ور رہا ہے تو اس سے اسلام کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ آخرکار اسلام فائدے ہی میں رہا ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں آرا ونظریات پیش کرنے کے لئے آزاد فضا پیدا ہو جائے اس طرح کہ مختلف صاحبان افکار اپنی باتیں پیش کر سکیں اور ان کے مقابلے میں ہم اپنی آراء ونظریات بیان کر سکیں اس طرح کے مقابلے میں اسلام زیادہ مضبوطی سے جڑ پکڑے گا۔

اس کے بعد آیت اللہ مطہری شہید نے پھر اپنی تجویز کو بیان کیا

---

[1] سورۂ الکہف:۲۹

ہے کہ تہران یونیورسٹی کے الٰہیات کالج میں ایک مارکسزم کی کرسی مقرر کی جائے۔اس تجویز کا ذکر گذشتہ تقریر میں ہو چکا ہے۔

میرا اعتقاد ہے کہ مخالف افکار سے نپٹنے کی راہ صرف یہی ہے۔ اگر ہم فکر پر پابندی عائد کریں گے تو اسلام اور اسلامی جمہوریہ کو شکست سے دوچار کردیں گے۔مگر جیسا کہ میں نے پہلے وضاحت کی ہے نظریات کا اظہار ''بلا اغوا واغفال'' ہونا چاہئے۔''اغوا واغفال''یعنی کہ کسی کام کو جھوٹ یا ناجائز پروپیگنڈے کے ساتھ ملا کر انجام دیا۔

فرض کیجئے کوئی شخص کسی جملے یا آیت کے کچھ حصے کو حذف کر کے اس میں اپنی طرف سے کچھ ملا دے اور پھر اس تحریف شدہ عبارت کو بطور صحت و دلیل پیش کرے، یا تاریخی مسائل کا کچھ حصہ بتائے اور کچھ حذف کر دے پھر ان ناقص معلومات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے من پسند نتائج اخذ کرے یا علمی دعویٰ قائم کرے۔''اغفال'' فریب دہی کو کسی طور پر بھی آزادی نہیں دی جاسکتی اور نہ ہونی چاہئے۔ اسی لئے اسلام میں اسی اجتماعی اور معاشرتی ضرر کی وجہ سے گمراہ کن کتب کی خرید وفروخت حرام ہے۔

اب میں اپنی گفتگو کا خلاصہ کرتے ہوئے نتائج کو سمیٹتا ہوں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارا انقلاب تبھی جاری رہے گا اگر ہم عدل و آزادی کا تحفظ کریں گے۔ سیاسی استقلال،اقتصادی استقلال ،ثقافتی استقلال،فکری استقلال اور نظریاتی استقلال ان سب کو محفوظ رکھیں۔ میں یہاں سیاسی اور اقتصادی استقلال کے مسئلے پر بحث نہیں کرونگا۔ کیونکہ یہ مسائل آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں مگر فکری اور ثقافتی استقلال کی جسے میں نظریاتی استقلال کہتا ہوں مزید وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ہمارا انقلاب تب کامیاب ہوگا جب ہم خالص اور لاریب اسلام کو اپنے نظریئے اور آئیڈیالوجی کی حیثیت سے دنیا میں متعارف کرائیں گے۔یعنی اگر ہم نظریاتی استقلال اور خودمختاری کے حامل ہوں اور اپنے نظریئے کو بلاخجالت وشرمندگی دنیا کے سامنے اسی طرح پیش کریں جیسا کہ حقیقت میں وہ ہے تو کامیابی کی امید رکھی جاسکتی ہے لیکن اگر اسلام کے نام پر کوئی ملا جلا نظریہ تیار کیا اور یہ روش اختیار کی

کہ ہرجگہ سے ایک چیز لی۔ کوئی چیز مارکسزم سے لی، کوئی چیز اگیزسٹنیشلزم (وجودیت) سے،کوئی چیز سوشلزم سے اور کوئی چیز اسلام کی بھی داخل کر لی اور اس مجموعے اور ملغوبے سے ایک معجون مرکب تیار کر لی اور کہا کہ یہ اسلام ہے تو ممکن ہے کہ شروع میں عوام اس اسلام نما چیز کو قبول کر لیں کہ شاید تھوڑی دیر تک حقیقت چھپی رہے مگر یہ بات ہمیشہ پوشیدہ نہیں رہ سکے گی۔ ایسے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جو اہل ذکر و تحقیق ہوتے ہیں اور حقیقت کو سمجھ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں کہ جناب آپ کی فلاں بات جو آپ نے اسلام کے نام پر فرمائی ہے ثابت ہو گیا ہے کہ اسلام کی چیز نہیں ہے۔ اسلامی مآخذ معلوم ہیں: قرآن، سنت، اسلامی فقہ اور معتبر اسلامی اصول سب کے سب ثابت شدہ ہیں، تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مثلاً یہ باتیں مارکسزم سے نکالی ہیں اور ان پر ایک اسلامی نقاب ڈال رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہی لوگ بڑے شوق سے اسلام کی طرف آئے تھے اور جنہوں نے انہی ملے جلے افکار کو اسلام کے نام پر قبول کر لیا تھا اب حقیقت آشکار ہونے پر انتہائی شدت اور تیزی کے ساتھ اسلام سے برگشتہ ہو گئے۔ اسی لئے میری نظر میں یہ ملے جلے اور مخلوط نظریات اسلام کے لئے دیگر واضح اسلام دشمن نظریات سے زیادہ نقصان دہ ہیں اور اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ ہمارا انقلاب اگر کامیابی کے ساتھ اپنی اصلی راہ پر گامزن رہنا چاہتا ہے تو اسے خود کو ان ملاوٹوں سے پاک رکھنا چاہئے اور اسے حقیقی اسلام یعنی قرآن اور اہلبیتؑ کے اسلام کی اقدار کے احیا کے راستے پر گامزن رہنا چاہئے۔

عدلِ اجتماعی

میں نے گزشتہ نشستوں میں ایران کے اسلامی انقلاب کی بقا ودوام کے تین بنیادی ارکان یعنی عدل اجتماعی، استقلال و آزادی اور معنویتِ اسلامی کے بارے میں اجمال و اختصار سے روشنی ڈالی تھی۔ آج شب پہلے رکن یعنی عدلِ اجتماع کے بارے میں مزید نکات پیش کرتا ہوں۔

ہم جانتے ہیں کہ تاریخ اسلام کی پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں ایک عظیم اسلامی انقلاب رونما ہوا میری مراد اس انقلاب سے ہے جو خلافت سوم کے آخری دور میں ظاہر ہوا۔ خلیفہ سوم نے پہلی بار دنیائے اسلام میں اشرافیت پر مبنی نظام حکومت قائم کیا جو کہ اسلامی اصولوں حتیٰ کہ خود ان سے قبل کے خلفاء کی سیرت کے خلاف تھا اور باوجود اپنے اس قول کے جو انہوں نے لوگوں کو بیعت کے وقت دیا تھا اور عہد کیا تھا کہ گذشتہ خلفاء کی سیرت کے خلاف عمل نہ کریں گے۔ انہوں نے اس کام کو سرانجام دیا۔ ان کے زمانے میں عوام کے لئے مال میں رغبت وتصرف کا دروازہ کھل گیا۔ حضرت علی نے اپنے ایک خطبے میں اسی نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے اس لئے خلافت کی ذمہ داری قبول کی ہے کہ لوگ دو گروہوں، شکم سیروں اور بھوک کے ماروں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت خلیفہ سوم کے دوری غلط کے نتائج کی جانب اشارہ تھا۔ ان کی بنیادی کمزوریوں کا ایک نقطہ قبیلہ پروری اور اقربا نوازی تھا۔ یہ قبیلہ والے اور رشتہ دار وہ تھے جو زمانہ جاہلیت میں ایک قسم کی اشرافیت کے انداز اختیار کر چکے تھے۔ خلیفہ سوم نے سب سے پہلے جاگیرداری

نظام رائج کیا یعنی عوامی اموال کا بیشتر حصہ ان لوگوں میں بانٹ دیا جو یا تو ان کے عزیز تھے یا دوست اور طرفدار۔ مزید برآں بیت المال سے خلاف معمول بڑی بڑی بخشش تک عطا کی گئی۔ اس طرح دس بارہ سال میں دنیائے اسلام میں دولت مندوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس کی نظیر اس سے پہلے موجود نہ تھی۔ سیاسی اعتبار سے بلند مناصب و مقامات ایسی اقلیت ہی میں تقسیم ہوتے اور گردش کرتے رہے۔

آخر ہر گوشے سے اعتراضات شروع ہو گئے۔ مختلف علاقوں سے لوگوں نے تنقید اور احتجاج کا سلسلہ شروع کر دیا اور اپنی ناراضگی کے اظہار کے لئے مدینہ کی طرف مہاجرت کا آغاز کر دیا اور جب زبانی اور تحریری احتجاج کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو آخر کار مختلف صوبوں سے بالخصوص کوفہ اور مصر سے شاکی اور احتجاجی لوگ آنے شروع ہو گئے اور مدینے کے لوگوں کے ساتھ مل کر خلیفۃ المسلمین کے خلاف مسلح بغاوت برپا کر دی۔ انہوں نے آخری لمحے تک مقاومت کی مگر بالآخر ان انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

اس دور میں صرف حضرت علیؑ کی ذات ہی ایسی تھی جو انقلابیوں کو بھی قبول تھی اور خلیفہ سوم کو بھی۔ اگرچہ وہ کبھی انہیں قبول کرتے تھے اور کبھی مسترد۔ حضرت علی علیہ السلام ہی انقلابیوں اور خلیفہ سوم کے درمیان ایک رابطے کے طور پر کام کرتے رہے۔ حضرت علیؑ انہیں مشورہ دیتے رہے کہ اپنا یہ انداز ترک کر کے عوام کے مطالبات کا مثبت جواب دیں اور اپنے گرد جمع شر پسند افراد کو ہٹا دیں۔ آپ نے مروان بن الحکم کو ان شر پسند حلقہ بگوشوں کا سرغنہ قرار دیا۔ مروان اور اس کے باپ کے وجود کو رسول اللہؐ نے اتنا خطرناک سمجھا تھا کہ مدینے سے جلاوطن کر دیا تھا اور فرمایا تھا کہ یہ کبھی مدینہ نہ آئیں ورنہ یہ کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کر دیں گے۔ خلیفہ اول کے دور میں حضرت عثمانؓ نے ان سے یہ اجازت چاہی کہ انہیں مدینے واپس لے آئیں لیکن انہوں نے اس مطالبہ کو قبول نہ کیا اور فرمایا کہ جسے رسول اللہؐ نے جلاوطن کیا ہو میں اسے واپس آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ خلیفہ دوم کے زمانے میں بھی انہوں نے اس سے درخواست کی کہ وہ ان دونوں کو واپسی کی اجازت دیں مگر انہوں

نے بھی اسے قبول نہ کیا۔ آخر کار جب حضرت عثمان خود منصب خلافت پر پہنچے تو انہوں نے نہ صرف ان کو مدینے آنے کی اجازت دی بلکہ مروان کا حکومت اسلامی کی شخصیت نمبر دو کی حیثیت سے تقرر کیا اور یہی شخص ان کے خلاف بہت سی ناراضگیاں پیدا کرنے کا سبب بنا۔

خلیفہ سوم کے زمانے میں حضرت علیؑ نے انہیں بار بار مشورہ دیا کہ مروان کو نکال دیں۔ وہ کبھی تو بات مان لیتے مگر اس پر عمل نہ کرتے۔ انہوں نے اتنی عہد شکنی کی اور اس قدر صرف نظر سے کام لیا اور عوام کے مطالبے سے اتنی بے اعتنائی برتی کہ آخر کار انقلابیوں نے ان کے گھر پر حملہ کر دیا اور انہیں قتل کر ڈالا۔ ان کے قتل کے فوراً بعد تمام لوگوں، چھوٹے بڑے، مرد و زن، پیر و جوان اور عرب و غیر عرب نے حضرت علی کے گھر پر ہجوم کر لیا اور ایک آواز ہو کر اعلان کیا کہ اب خلافت اسلامیہ کے لائق واحد شخصیت آپؑ ہی کی ہے اور آپ کو خلافت سنبھالنی چاہیے۔

حضرت علیؑ نے عوام کی دعوتِ خلافت کے واقعے کا ذکر اپنے ایک خطبے میں فرمایا ہے حضرت علی کے بیانات سے ایک دل چسپ نکتہ جو اخذ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کا انقلاب آج کے ایران کے انقلاب کی طرح ایک ایسا انقلاب تھا جو لوگوں کے تمام طبقات کی طرف سے تھا۔ یعنی نہ صرف فقرا بلکہ امرا نے بھی انقلاب بپا کرنے میں حصہ لیا تھا۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں، نہ صرف عرب بلکہ حجازی، مصری اور ایرانی حتی کہ سب کے سب انقلاب میں شریک تھے۔ حضرت علیؑ نے خلافت سے اجتناب کیا تاکہ انہیں یہ سمجھایا جائے کہ مسئلہ فقط خلیفہ سوم کے چلے جانے کا نہیں ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ چلے گئے اور کام ختم ہو گیا۔ خاص طور سے وہ لوگ جو ان کے دور میں بہرہ مند ہوتے اور دولت و حشمت سمیٹتے رہے تھے یہ خیال کرتے تھے کہ ان کے چلے جانے اور علیؑ کے آ جانے سے اجتماعی حالت میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ علی نے ان لوگوں سے جو ان کی بیعت کرنے آ رہے تھے فرمایا ''افق عالم پر گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ [1] یعنی جس طرح گھٹا سے پر فضا میں نظر

---

[1] نہج البلاغہ: خطبہ ۹۲

نہیں آ تا اس طرح اب معاشرتی مسائل کا افق بھی تیرہ وتار ہے۔عقلیں مسائل کی گہرائی کو نہیں پا سکتیں۔لوگ کہتے ہیں کہ علیؑ آ ئیں مگر یہ سوچا ہی نہیں کہ اگر علی آ گئے تو انہیں کیا کرنا چاہئے اور وہ کیا کریں گے۔راہ مستقیم کونہیں پہنچانا اور راہ اسلام کوفراموش کر دیا ہے۔لوگوں کوازسرنو اسلام کی نشاندہی کرنا ہے۔انہیں بے راہروی کی عادت ہوگئی ہے۔ میں تمہاری دعوت کا جواب نہ دوں تو میری ایک ہی شرعی ذمہ داری ہےلیکن اگر جواب میں خلافت کوقبول کرلوں تو تمہارے ساتھ وہی سلوک کرنا ہوگا جسے میں بہتر سمجھوں گا۔

اس کے بعد آپ نے ان لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جو بلا استحقاق مناصب پر فائز رہے تھےاور بغیرحق کے دولت جمع کرتے رہے تھےفرمایاوہ تمام دولت جو عثمانؓ کے زمانے میں لوگوں سے ناحق لی گئی ہےسب کی سب واپس کراؤں گا۔خواہ اس دولت سے شادیاں کی گئی ہوں اوراس سے ان کاحق مہرادا کیا گیا ہو۔اس وقت آپ نے ایک بہت عجیب نکتہ ارشادفرمایا کہ''ان فی العدل سعة ''یعنی عدل میں اتنی وسعت و گنجائش ہے جوکسی دوسری چیز میں نہیں۔اس موقع پر کچھ لوگوں نے مشورہ کےطور پر آپ سے کہا کہ اگر آپ اس طرح عمل فرمائیں گےتو کئی لوگ ناراض ہوجائیں گے۔آپ نے ان کے جواب میں یہ لطیف بات اشارہ فرمائی کہ عدل میں بہت وسعت ہے۔ایسی چیز جس میں سب طبقات اور افراد سما سکیں اور سب کی رضامندی بھی حاصل رہےتو وہ صرف عدل ہے اگر کوئی عدل سے راضی نہیں توظلم بھی اس کو راضی نہیں کرسکتا۔یعنی یہ نہ سمجھئے کہ جولوگ عدل سے ناخوش ہوتے ہیں اگر میں عدل کوترک کردوں اوراس کی بجائےظلم کواختیارکروں تو وہ خوش ہوجائیں گے۔نہیں اگر میں چاہوں کہ ان کی حرص کی تسکین کروں تو وہ حریص تر ہوتے جائیں گے۔حداعتدال تو وہی عدل ہے ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ میں کسی کے فائدے کے لئے عدل کی حد کو پھلانگ ڈالوں اوروہ راضی ہوجائے۔

امیر المومنین نے صراحت سے بیان کر دیا۔ ان کی سیاست واضح تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ جو کام انہیں کرنا ہے وہ ان کے دل میں ہی پوشیدہ رہے اور یہ سوچیں کہ ابھی

میں صاف بات نہ کروں تا کہ یہ لوگ جو آج آئے ہیں اور میری بیعت کر رہے ہیں یہی سمجھیں کہ موجودہ نظام جس طرح ہے اسی طرح رہے گا۔مگر بعد میں جب حالات پر کنٹرول حاصل ہو جائے تو اپنے پسندیدہ منشور کو نافذ کر دوں۔علیؑ کی نگاہ میں اس عمل کا مطلب غفلت میں رکھنا ہے۔اسی لئے انہوں نے وضاحت سے اعلان کیا کہ اے لوگو جو آج میری بیعت کر رہے ہو یہ جان لو کہ میں تمہارے ساتھ اغفال نہیں برت رہا ہوں۔میرا حکومتی منشور یہ ہے۔

اس منشور کے اعلان کے ساتھ اسی اول روز سے ہی حکومت علیؑ کی مخالفت کا آغاز ہو گیا پہلی با قاعدہ مخالفت جنگ جمل میں ظاہر ہوئی۔طلحہ وزبیر رسول اکرمؐ کے دور میں اسلام کی خادم شخصیتیں تھیں مگر خلافت سوم میں نظام حکومت کے مخصوص حالات کی بنا پر ان بڑی بڑی بخششوں کے سبب جو انہیں عطا کی گئیں بڑے دولت مندوں کی شکل میں ابھرے۔جب انہوں نے یہ دیکھا کہ علی ان کے اموال کو واپس لینے کا ارادہ رکھتے ہیں اور پھر زبیر نے کہ جب بھی بیت المال میں تقسیم کا موقع ہوتا تھا تو اس کا حصہ دس بیس ہزار دینار سے کم نہ ہوتا تھا اب جو دیکھا کہ علیؑ جب بھی بیت المال کو تقسیم کرتے ہیں تو اسے صرف تین یا چار ہزار دیتے ہیں اور اتنے ہی اس کے غلام کو دیتے ہیں یہ بات زبیر کے لئے قابل برداشت نہ تھی طلحہ کے لئے بھی یہ صورتحال ایسی ہی تھی اس وجہ سے ان دونوں حضرات نے جنگ جمل کے اسباب فراہم کر دیئے۔

جنگ جمل کے بعد جنگ صفین بپا ہوئی معاویہ جو کہ خلیفہ سوم کا عزیز تھا بیس برس سے ممالک شام کا خودمختار اور مطلق العنان گورنر تھا یہ مدت اس قابل تھی کہ وہ اپنی حکومت کی بنیادیں خوب مضبوط کر لے۔

حضرت علی علیہ السلام نے بیعت کے بعد ارشاد فرمایا کہ میں کسی طور بھی اس بات پر

راضی نہیں کہ معاویہ کی گورنری کی توثیق کروں اسے برطرف ہونا چاہیئے۔ مصلحت کوشوں نے عرض کی کہ حضور عبوری طور پر کچھ عرصہ اس کو برقرار رہنے دیجئے۔ آپ نے فرمایا! میں ہرگز یہ کام نہ کروں گا۔ اس صاف جواب کے بعد معاویہ نے جنگ صفین کا راستہ اختیار کیا۔

جنگ صفین کے بعد جنگ خوارج برپا ہوئی جس کا ماجرا کم وبیش آپ سب کو معلوم ہے نتیجہ یہ نکلا کہ عدل کا حضرت علی علیہ السلام کو جو شدید خیال تھا کہ اس کی وجہ سے آپ کی خلافت کے چارسال اور چند ماہ کی مدت مسلسل مبارزہ اور مقابلہ کی حالت میں ہی گزری اور ایک لمحہ بھی آپؑ کو چین نہ ملا۔ آپؑ حکومت صرف عدل قائم کرنے کے لئے چاہتے تھے اور یہی عدل پسندی کی شدت آخرکار محراب عبادت میں آپؑ کی شہادت پر منتج ہوئی۔

علیؑ کی خلافت کا دور آپؑ کے لئے زندگی کا تلخ ترین زمانہ شمار ہوتا ہے لیکن آپؑ کے مکتب ونظریئے کی رو سے آپ اسلامی معاشرے میں عدالت کا بیج بودینے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر اس مختصر دور کی بجائے آپؑ کو بیس سال کی خلافت نصیب ہوتی مگر اس طرح کہ خلیفہ سوم کے زمانے کا نظام باقی رہتا تو آج نہ اسلام رہنا، نہ علی ہوتا نہ نہج البلاغہ اور نہ ہی عدل اسلامی کا نام باقی رہتا۔ ہاں علیؑ بھی ایک خلیفہ ہی شمار ہوتے......معاویہ جیسوں کی صف میں۔

علیؑ کا طریق وطرز ہمیں سکھاتا ہے کہ صرف سیاسی حکومت کی تبدیلی، اعلی عہدوں کا تغیر وتبدل غیر صالح افراد کو ہٹا کر صالح افراد کا تقرر کرنا، ان تمام امور کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی اثر ہوتا ہے اگر عدل اجتماعی اور اقتصادی انتظامات کے نقطہ نظر سے اس معاشرہ کی بنیادوں میں تبدیلی نہ لائی جائے۔ لوگ علیؑ سے کہتے تھے کہ آج کے قانون کو سابقہ دور سے موثر نہیں ہونا چاہیئے۔ آپؑ جو چاہے کیجئے مگر قانون کو آج کے بعد ہی کے حوالے سے نافذ کیجئے۔ آپؑ عدل قائم کرنا چاہتے ہیں تقسیم میں مساوات کا خیال رکھنا چاہتے ہیں بہت خوب! مگر آج سے جو کچھ ہمیں سابق خلیفہ کے دور میں ملا ہے وہ مال سابق اور آپ کے دور حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

علی علیہ السلام ان سب کے جواب میں نصیحت کے انداز میں فرماتے تھے کہ نہیں! قانون الٰہی سابقہ معاملات پر بھی موثر ہے۔'' ان الحق القدیم لا یبطله شیٔ '' پرانے حق کو کوئی چیز ختم نہیں کرسکتی۔ جب بھی مجھ پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ حق یہ ہے اور باطل وہ تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس معاملہ پر سالوں گزر گئے ہیں مجھے چاہئے کہ میں حق کو اس کی جگہ پلٹا دوں۔

ہمارے انقلاب اسلامی کی آئندہ صورت کے بارے میں بنیادی ترین مسائل میں سے ایک یہی مسئلہ عدل اجتماعی ہے۔ اس معاملے میں یہ بنیادی سوال درپیش ہے کہ عدل اجتماعی کا اسلام میں کیا تصور ہے؟ کیونکہ عدل اجتماعی کے بارے میں تصورات خاصے متضاد ہیں۔ عدل اجتماعی کے بارے میں ان تصورات میں سے ایک یہ ہے کہ تمام لوگ جس طرح اور جس حالت میں بھی ہوں جس طرح بھی معاشرے میں کام کریں اور جو بھی استعداد رکھتے ہوں، انہیں بہر حال بالکل ایک دوسرے کی مانند زندگی بسر کرنی چاہئے۔ اس گروہ کی نگاہ میں عدل اجتماعی کا مطلب ایسی مساوات ہے کہ مثلاً سب کا لباس یکساں ہونا چاہئے۔ اگر آپ سوتی کپڑے کا لباس پہنیں تو مجھے بھی سوتی لباس ہی پہننا چاہئے اگر میں ریشمی لباس پہنوں تو آپ کے لئے بھی ریشمی لباس ہونا چاہئے اس گروہ کے نقطہ نظر سے تمام افراد کی اک گونہ درجہ بندی ہو جاتی ہے کہ سب کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق کام کرنا ہو مگر انہیں ان کی ضرورت کے مطابق ہی آمدنی ہو۔ ممکن ہے میری استعداد آپ سے نصف ہو مگر میرا کنبہ آپ سے دگنا ہو اس لئے مجھے آپ سے دگنی آمدنی ملنی چاہئے۔ عدل اجتماعی کا یہ تصور محض ''اجتماعی'' ہے یعنی اس میں بس معاشرے کا خیال رکھا جاتا ہے فرد کا نہیں اس نقطہ نظر میں فرد کی قطعاً اہمیت نہیں فقط معاشرے ہی کی اہمیت ہے کہ معاشرہ ہی برسرعمل ہے اس لئے معاشرے ہی کو خرچ کرنے کا حق ہے۔

عدل اجتماعی کا دوسرا تصور یہ ہے کہ اس میں فرد اور اس کی اہمیت و آزادی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ افراد کے لئے میدان کھلا رہنا چاہئے۔ اور ان کی سیاسی و

اقتصادی آزادی پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہئے۔ ہر شخص کو اپنی کوشش سے دیکھنا چاہئے کہ وہ کس قدر آمدنی پیدا کر سکتا ہے اور اس آمدنی کو نجی قرار دے۔ دوسری چیز یہ کہ اس بات کا تعلق فرد سے نہیں کہ دوسرے کا حصہ اس سے زیادہ ہے کہ کم، ہاں! آخر میں معاشرے کا فرض ہے کہ خیال رکھے افراد کمزور نہ رہ جائیں اس لئے وہ مالدار افراد کے مالوں پر ٹیکس عائد کر کے کمزور افراد کا اس حد تک تحفظ کرے کہ وہ بالکل ہی پاؤں سے نہ اکھڑ جائیں۔

یہاں ان دونوں اہم مسئلوں یعنی ایک طرف عدل اجتماعی اور دوسری طرف آزادی فرد میں ایک تضاد ابھرتا ہے البتہ یہاں آزادی سے مراد ہے اقتصادی حرکت اور سیاسی عمل دونوں کی آزادی۔ اگر عدل اجتماعی اس طرح استوار ہو کہ اس میں صرف معاشرے کو ہی ملحوظ رکھا جائے اور بس تو آزادی فرد کو کم از کم اس کے کسی گوشے میں دفن کرنا ہوگا اور اگر اقتصادی آزادی محفوظ رہے گی تو عدل اجتماعی کے اس مفہوم کا وجود نہیں رہے گا جس کا کہ پہلا گروہ منتظر ہے۔

آج کی دنیا میں ایک اور درمیانی حالت کی طرف رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے بارے میں شاید یہ کہا جا سکتا ہے کہ کمیونزم اور کیپٹیلزم (سرمایہ داری) کی دو دنیاؤں کے پہلو میں ایک تیسری دنیا پیدا ہونے کو ہے جسے ایک طرح کے سوشلزم [1] کا نام دیا جا سکتا ہے یہ تازہ رجحان آزادی فرد کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا ہے اور یوں نجی ملکیت کو ایک معقول حد تک تسلیم کرتا ہے اور یہ ہر ملکیت کو استحصال کی طرح نہیں سمجھتا حتیٰ کہ یہ کہتا ہے کہ پہلی شکل کا عدل اجتماعی خود ایک طرح کا ظلم ہے کیونکہ جب ایک فرد کے کام کی کمائی خود اسی کی ہے تو جب وہ اس کی آدھی کمائی اس سے لے لیتے ہیں خواہ اس بنیاد پر کہ دوسرے کے اخراجات زیادہ ہیں تو یہ بات خود ایک بے عدلی ہے۔ استحصال اپنی ہر شکل میں غلط ہے۔ اگر میں آپ کو کسی کام پر مقرر کروں اور آپ کی کمائی کا ایک حصہ اپنے لئے قرار دوں تو میں نے آپ کا

---

[1] کمیونزم جو کہ خود کو سوشلزم ہی قرار دیتا ہے اس میں اور اس قسم کے سوشلزم میں یہ فرق ہے کہ یہ خود کو جمہوری، انقلابی اور اخلاقی سوشلزم قرار دیتا ہے۔

استحصال کیا اور یہ ظلم ہے۔ لیکن اگر میں خود اپنی مرضی سے اپنے مال اور اپنے ہاتھوں کی کمائی کو کسی دوسرے کو دوں تو یہ عین انسانیت اور کمال ہے۔ سرمایہ داری کا اس لئے محاسبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اندر استحصال کو پرورش کرتی ہے۔ سرمایہ داری تمام منافع کا تعلق سرمائے ہی سے قرار دیتی ہے اور اس بات سے ناہمواری اور نابرابری پیدا ہوتی ہے ایسے میں اس تازہ فکر کا نعرہ یہ ہے کہ:

''آؤ وہ راہ اپنائیں جس سے استحصال کا کلی خاتمہ کیا جا سکے بغیر اس کے ہم شخصیت، ارادہ اور آزادی فرد کو کچل ڈالیں ہم کوشش کریں کہ افراد انسانی ترقی کے جذبے کے تحت اور جو روحانی اخلاقیت و شرافت اور انسانی درد وہ رکھتا ہے اس کے تحت اپنے اخراجات سے زائد آمدنی کو ضرورت مند بھائیوں کو پیش کریں۔ نہ یہ کہ ہم اس کی کمائی کو بزور لے کر دوسروں کو دے دیں۔''

یہ وہ اخلاقی سوشلزم ہے جس کی تلاش میں اسلام سرگرداں رہا ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ آپؑ نے ایک شخص سے استفسار فرمایا۔

''تم لوگوں کے درمیان اسلامی اخوت اور بھائی چارہ کس قدر ہے؟

آپؑ نے فرمایا کیا اس قدر کہ ایک بھائی جب ضرورت مند ہو تو اپنے بھائی کی دکان میں آ کر اس کے گلے یا سیف سے جتنی ضرورت ہو رقم لے لے اور جس کے پیسے ہوں وہ قطعاً کوئی تکلیف محسوس نہ کرے؟

اس نے عرض کی: نہیں حضور ایسی نہیں۔

آپؑ نے فرمایا: پھر تم نے کیسے کہا کہ انتہائی بلند درجے کا۔ بھائی چارہ تو یہ ہے کہ اگر ایک بٹوے میں اپنے لئے جتنی رقم رکھے اتنی ہی دوسرے میں اپنے بھائیوں کے لئے رکھے؟[1]۔

---

[1] مجھے اس حدیث کا متن نہیں مل سکا مگر اسی مفہوم کی حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے بھی روایت کی گئی ہے جو کتاب الکافی کی دوسری جلد میں صفحہ ۲۴۳ پر درج ہے۔ (مترجم)

اگر یہ انداز قائم ہو جائے تو یہی وہ اخوت اسلامی ہے جس کا پشت پناہ اسلام ہے۔ اسلام اس بات کا حامی ہے کہ زندگیاں برادرانہ ہوں نہ کہ ہم افراد کو بس قانون کے زور پر مجبور کریں کہ ان کی کمائی کوئی نہیں وہ بس بقدر ضرورت ریاست سے ہی لیں۔ یعنی وہ طریقہ جو کمیونسٹ ممالک میں رائج ہے کہ ان سے سب کمائی لے لو اور انہیں ریاست کے غلام بنا دو۔ چاہیے تو یہ کہ مادی زندگی کا اشتراک عوام کی روحانی شرکت سے پیدا ہو۔ پہلے چاہیے کہ روحیں ایک ہوں پھر بٹوے اور جیبیں تو جدا ہوں اور یہ چاہا جائے کہ بزور طاقت بٹوے ایک کر دیئے جائیں یا یہ طاقت سے بٹوے خالی کرا لیں اور ریاست کا بٹوا پر کر دیں تو وہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دے۔ [1]

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ عدل اجتماعی کے بارے میں تعبیرات مختلف ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام کی تعبیر کیا ہے؟ کیا اس کی تعبیر بھی وہی ہے جو کمیونزم بیان کرتا ہے؟ یا اسلام اس بارے میں سرمایہ داری سے موافقت کرتا ہے؟ یا اس کی کوئی اور تعبیر ہے جو ان

---

[1] چند سال پہلے ایک اخبار نے ایک سویڈش شخص کے قول پر مبنی ایک فیچر شائع کیا تھا، اسے آپ کے لئے نقل کرنا مناسب رہے گا۔ فیچر کا عنوان تھا'' سیاست اور محنت ''ایک سویڈش سے پوچھا گیا تھا کہ سوشلزم کیا ہے؟ اس نے جواب دیا:

سوشلزم یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس دو گائیں ہیں اور ہمسائے کے پاس کوئی گائے نہیں تو ایک گائے ہمسائے کو دے دو۔

سرمایہ داری یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس دو گائیں ہیں تو ایک کو فروخت کر کے بیل خرید لو اور ان کی نسل کشی میں مصروف ہو کر ان کی تعداد میں اضافہ کرتے رہو۔

کمیونزم یہ ہے کہ دونوں گائیں تم سے حکومت لے لے اور اس کے بدلے ہر صبح ایک پانی ملا دودھ کا پیالہ دے دیا کرے۔

نازی ازم یہ ہے کہ دونوں گائیں حکومت لے لے اور تمہیں انسان سوز عقوبت خانے میں ڈال دے۔

اس کے نیچے ایرانی فیچر نگار نے یہ اضافہ کیا تھا کہ ایرانی ازم یہ ہے کہ دونوں گائیں حکومت لے کر ایک کو مذبحہ خانہ بھیج دے اور دوسری کا دودھ دوھ کر نالی میں بہا دیا کرے۔

سب سے مختلف ہے؟ اس بارے میں انشاء اللہ آئندہ راتوں میں تفصیل سے گفتگو کروں گا۔ لیکن اس گفتگو میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلام معنویت واخلاقیت کو اس کا جزو لاینفک قرار دیتا ہے۔ اسلام اور دیگر مکاتب فکر میں عدل اجتماعی کے بارے میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ اسلام معنویت واخلاقیت کو بنیاد واساس قرار دیتا ہے۔ اس پہلو کے بارے میں ہمارے پاس تاریخ اسلام میں اسلامی رہنماؤں کے ایسے بہت سے نمونے محفوظ ہیں جو ہمارے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔ خود اسلام عدل اجتماعی اور اسلامی معنویت واخلاقیت کے تعلق کے بارے میں جتنا حساس ہے اس کی نظیر کسی اور مکتب فکر میں نہیں ہے۔

فتح مکہ کے سال میں ایک عورت سے جرم سرزد ہوا جس پر حد جاری ہوتی تھی۔ جس عورت نے چوری کی اتفاق سے وہ ایک بڑے قبیلے کی تھی جو قریش کے صف اول کے اشراف میں سے تھا۔ جب اس کے بارے میں حد جاری کرنے اور ہاتھ کاٹنے کا وقت قریب آیا تو اس کے قبیلے کا سردار یہ کہتا ہوا نکل کھڑا ہوا کہ افسوس ہم یہ ننگ وعار کیونکر برداشت کرسکیں گے اور ایک جماعت لیکر حضور کی خدمت میں حاضر ہوکر درخواست کی کہ اس عورت کی سزا کو نظر انداز فرمایا جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہرگز نظر انداز نہیں کروں گا۔ متعدد سفارشی اور واسطے آپؐ کی خدمت میں ارسال کئے گئے مگر آپؐ نے مطلق اثر قبول نہ فرمایا بلکہ لوگوں کو جمع کر کے خطاب فرمایا:

''کیا تم جانتے ہو کہ سابقہ امتیں کیوں برباد ہوئیں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایسے معاملات میں درگزر کو جائز سمجھتی تھیں۔ اگر مجرم کسی بڑے قبیلے کا نہ ہوتا یا اس کے پاس سفارش اور واسطہ نہ ہوتا تو اسے جلد سزا دے دی جاتی لیکن اگر مجرم کے پاس واسطہ یا سفارش ہوتی تو اس کے لئے قانون حرکت میں نہ آتا۔ اسی وجہ سے خدا ایسی قوموں کو تباہ کیا کرتا ہے۔ میں اس کے لئے بالکل تیار نہیں کہ کسی کے بارے میں بھی یہ طریقہ برتوں۔''

یا یہ جو جناب علی علیہ السلام سے روایت نقل کی جاتی ہے کہ ایک روز آپؑ نے اپنی بیٹی کی گردن میں ایک ہار دیکھا، سمجھ گئے کہ یہ ہار بیٹی کا نہیں ہے۔ آپ نے پوچھا، یہ

کہاں سے لیا ہے؟ بیٹی نے عرض کی کہ بیت المال سے ''باضمانت عاریتاً'' لیا ہے یعنی عارضی طور پر لیا ہے اور واپسی کی ضمانت دی ہے۔علیؑ نے فوراً بیت المال کے افسر کوطلب کر لیا اور فرمایا: تمھیں یہ اختیار کہاں سے ملا کہ یہ ہار میری بیٹی کو دے دو؟ اس نے عرض کی، امیر المومنین آپؑ کی بیٹی نے مجھ سے ضمانت پر عاریتاً لیا ہے۔آپ نے فرمایا خدا کی قسم اگر ضمانت وعاریت کی بات نہ ہوتی تو میں اپنی بیٹی کے ہاتھ کاٹ دیتا۔

یہی وہ احساس ہے کہ جس کی ہمارے آئمہ اور پیشواؤں نے۔ جو کہ مجسم اسلام اور سچے معلم اسلام تھے......عدل اجتماعی کے بارے میں خود نشان دہی فرمائی۔ اگر ہمارا انقلاب بھی اپنی راہ پر باقی رہنا چاہتا ہے تو اسے ایسے اعمال اور ایسی عدل پسند اور عدل طلب روش کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آزادی وخود مختاری

آج رات میں جس موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں وہ آزادی وخود مختاری کا مسئلہ ہے۔ بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے اور اپنے والد، والدہ یا دادا کی زیر نگرانی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے تو وہ آزادی وخود مختاری کا مالک نہیں ہوتا، وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا اور کوئی بھی کام سرانجام دینے کے لئے وہ دوسروں کی اجازت کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ تو تھی غیر خود مختاری کی ایک قسم اور اس کا ایک درجہ۔

دوسری قسم ان افراد کی ہے جو غلام ہوتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی کا غلام ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اس قابل ہوتا ہی نہیں کہ خود کوئی فیصلہ کر سکے بلکہ دوسرے ہی اس کی جانب سے فیصلہ کرتے ہیں اور اس کا عزم وارادہ ہر معاملے میں دوسروں کی اجازت کا مرہون منت ہوتا ہے۔

ان دو کے علاوہ بھی کچھ اور حالات ہیں جن میں افراد اپنی خود مختاری سے ہاتھ دھو لیتے ہیں.....نابالغ اور مجنون کے علاوہ.....مثلاً بہت سے گھروں میں خادم اور خادمائیں ہوتی ہیں جو خود مختاری کی مالک نہیں ہوتی اور جاگیردارانہ نظاموں میں خاص کر مغرب کے، زمینوں پر کام کرنے والے مزارع [1]

---

[1] آپ نے یہاں سرف (SERF) کا لفظ استعمال کیا ہے جو مغرب کے جاگیرداری نظام میں مزارع کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس مزارع کی حالت بس غلام جیسی ہوتی تھی۔ (مترجم)۔

اور کسان تک آزاد و خود مختار نہیں ہوتے [1]

مذکورہ بالا حالات افراد کی سطح پر بے استقلالی اور عدم حریت کی مثالیں ہیں [2]

جس طرح آزادی و استقلال اور عدم حریت و بے اختیاری کا مسئلہ افراد کو درپیش ہے اسی طرح یہ معاشرے اور ریاست کو بھی بدرجہ اولیٰ درپیش ہے۔ ہمارے زمانے میں غلامی و آقائی کی قدیم صورت تو موجود نہیں مگر ریاستوں کی سطح پر آج بھی شدت سے غلامی و آقائی کے تعلقات موجود ہیں۔ دنیا کے نقشے پر ایک نظر ڈال کر ہم بہ صراحت دیکھ سکتے ہیں کہ بعض ممالک آقا و سردار ہیں جبکہ کچھ ممالک محض نام کے آزاد ہیں یہاں تک کہ ان کے تمام کام پہلی قسم کے مالک کی ہدایات یا اثر و نفوذ کے تحت انجام پاتے ہیں۔ اس صورت

---

[1] مغرب کا جاگیرداری نظام مشرق کے نظام سے بہت مختلف تھا مغرب میں کسانوں کی جو حالت تھی وہ آزادی و غلامی کے بین بین تھی۔ یوں کہ کسان مالک کا غلام تو نہ تھا مگر زمین چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن مشرق میں یہ صورتحال نہ تھی، خود ہمارے ایران میں زمینوں پر کام کرنے والے کسان آزاد تھے کہ جب چاہیں وہاں رہیں اور جب چاہیں چھوڑ دیں۔ اگر مزارع اپنے زمیندار سے راضی ہوتا ہے تو اگلے برس بھی اس کے پاس رہتا ہے یا آئندہ سالوں میں بھی وہیں رہتا لیکن اگر اسے زمیندار کا برتاؤ اچھا نہ لگتا یا اسے معلوم ہوتا کہ دوسری جگہ کا زمیندار اچھا سلوک کرتا ہے تو وہ جانے میں آزاد ہوتا ہے اور کوئی اس کی راہ نہیں روک سکتا۔ اور یہ زمیندار مجبوراً کسی اور مزارع کی منت کر کے اسے کام پر لگاتا۔ مغرب میں یہ طے تھا کہ کسان اپنے خاندان سمیت ابد تک اسی جگہ کام کرے گا اور وہیں رہے گا جہاں وہ پیدا ہوا ہے اگر وہ کہیں چلے جانا چاہتا تو اس کی راہ روک لی جاتی اور اگر بفرض محال وہ خفیہ طور پر نکل بھاگتا اور کسی دوسرے زمیندار کے ہاں کام تلاش کرتا تو قوانین کی رو سے اس زمیندار کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اسے کام پر لگا لے بلکہ اس کا فرض تھا کہ وہ اسے پکڑ کر سابقہ زمیندار کے حوالے کر دے۔ ان کسانوں کی بے استقلالی اس قدر تھی کہ زمین یا کھیت کی خرید و فروخت کی صورت میں وہ بھی خود بخود فروخت ہو جاتے تھے۔

[2] البتہ کبھی ایک شخص کسی جماعت یا گروہ کا رکن ہوتا ہے اس صورت میں وہ اپنے ذاتی کاموں میں خود مختار ہے مگر ان کاموں میں جو جماعت سے متعلق ہیں ان میں وہ خود ہی فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ ضابطے کے تحت ایک قانون پوری جماعت پر لاگو ہوتا ہے۔ مگر یہ وہ بے استقلالی کی حالت نہیں ہے۔ جس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے یہ بے استقلالی رضاکارانہ ہے۔

حال کو ہم اپنے ممالک میں صحیح شکل میں مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خلیج اور بحر ہند میں بڑی طاقتوں کے درمیان زبردست سیاسی رسہ کشی ہے۔ امریکہ اپنے مفادات کے لئے خلیج کا تحفظ چاہتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل دوسری طاقتوں کے بھی یہی عزائم ہیں۔ لیکن ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل امریکہ اس میدان میں دوسری خود پرست طاقتوں سے سبقت لے گیا تھا کیونکہ اس وقت امریکہ اس علاقے میں (بلا اعلان) ایک غلام کا مالک تھا۔

اس میدان میں امریکی جو کچھ کر رہے تھے وہ اس سے عبارت ہے کہ ایک طرف وہ ایرانی سرمائے ہی سے ایرانی تیل کو اس قدر وسیع مقدار میں حاصل کر رہے تھے جو کہ غارت گری اور استحصال کے مشابہ تھا اور دوسری طرف تیل کی قیمت کا بڑا حصہ وہ ایران کو جدید اسلحہ کی فروخت کے عنوان سے واپس لے جاتے تھے علاوہ ازیں انہوں نے علاقے میں اپنے مفادات کی نگرانی کے لئے شاہ کو اپنا تھانیدار مقرر کر دیا تھا اور شاہ کی حکومت اس بات کی دعویدار تھی کہ وہ آزاد اور قومی سیاست کی راہ پر گامزن ہے اور جو اسلحہ خریدا جا رہا ہے وہ ہمارے دفاع کے لئے ہے۔

اقتصادی خود مختاری کے میدان میں ہم نے دیکھا کہ ایران کی زراعت و حیوانات کی دولت میں بڑی حد تک کمی کرنے پر مجبور کر دیا گیا تا کہ وہ باہر سے غلہ، چینی، گوشت اور دیگر اشیا درآمد کرے دوسری طرف وہ صرف اسمبلنگ پلانٹ لگانے اور مغرب کی ذیلی اور طفیلی اشیائے صرف ہی تیار کرنے پر مجبور تھا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سابقہ نظام کے اخباری اعداد و شمار کے مطابق ہمارے ملک کی غذائی ضروریات میں سے ۹۵ فیصد بیرون ملک سے درآمد کی جاتی تھیں اور کوئی ایسا میدان نہیں رہا تھا جس میں ہم خود پر انحصار کر سکتے۔

گزشتہ دور میں ہم جس صورتحال میں گرفتار تھے وہ بدترین قسم کی اسیری و غلامی تھی نہ صرف اقتصادی معاملات میں انہوں نے ہمیں پابند بنا دیا تھا بلکہ ہر میدان میں وہی

ہماری ضروریات کا تعین کرتے تھے۔ [1]

امام خمینی مدظلہ العالی..... پیرس میں اپنی اقامت کے آغاز سے ہی..... ایران ارسال کئے جانے والے اپنے بیانات میں زراعت میں اضافے پر زور دیتے رہے۔ بالخصوص گندم کی کاشت پر اور ہم نے دیکھا کہ یہ تاکید کتنی اہم تھی۔ خاص طور سے اس سال جو کہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا مبارک سال ہے یعنی آزادی کا پہلا سال [2]

دیکھئے جب کوئی مملکت اپنے قدموں پر کھڑا ہونا چاہتی ہے اور اپنے فیصلے خود کرنا چاہتی ہے تو وہ ہمت و مردانگی سے غلامی کی زنجیریں اور بوجھ اتار پھینکتی ہے ایران جو ہر سال امریکہ سے گندم درآمد کرتا تھا اس سال خود کفالت کی منزل کو پہنچ گیا اور وہ دن دور نہیں جب قوم کی ہمت سے ہماری مملکت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجائے گی اور ہر میدان میں غیروں کی محتاجی سے نجات پالے گی۔

---

[1] افسوس تو یہ ہے کہ اس معاملے میں تیسری دنیا کے ممالک کی قسمت ایک سی ہے۔ مرحوم آیت اللہ امینی طاب ثراہ کی ایک بات آپ کے لئے نقل کرتا ہوں جو میرے اس مدعا پر شاہد ہے۔ آپ بتاتے تھے کہ عراق میں نوری السعید کے زمانے میں اسمبلی کا ایک رکن جو شیعہ تھا اور مرحوم امینی کے عقیدت مندوں میں سے تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مرحوم امینی نے اس سے پوچھا کہ آخر تم ارکان اسمبلی کے پاس علم لدنی کہاں سے آ گیا؟ ہم تو اپنے علمی کاموں میں نیا نقطہ نظر پیش کرنے سے پہلے ہر ضروری مقام کا مطالعہ کرتے اور وقت صرف کرکے تحقیق کرتے ہیں مگر یہ کیا ہے کہ تم اسمبلی میں پیش ہونے والے سیاسی پروگرام کی دو یا تین گھنٹوں میں توثیق یا تردید کر ڈالتے ہو۔ اس نے ہنس کر جواب دیا، بات سادہ سی ہے جب ہم صبح کو اسمبلی میں جاتے ہیں تو ہمیں بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا مسئلہ پیش ہوگا سب سے پہلے نوری السعید کا نمائندہ اسمبلی میں آتا ہے اور کچھ ارکان سے کہہ دیتا ہے کہ تم کہنا: ہاں اور کچھ سے کہہ دیتا کہ تم کہنا ناں، اس طرح یہ پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کتنے ارکان موافقت میں ہوں گے اور کتنے مخالفت میں۔ بعد از اں قانون اسمبلی میں پیش ہوتا ہے تو ہم اس کے مندرجات سے واقف ہوتے ہیں مگر حسب سابق ایک قیام وقعود سے اس کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

[2] ایک شخص خراسان سے مجھے ملنے آیا تھا۔ یہ ساٹھ سال کا بوڑھا شخص تھا اس نے بتایا کہ ہمارے سو سال کے بزرگوں کو بھی یہ یاد نہیں کہ کسی سال اتنی آمدنی ہوئی ہو جتنی کہ اس سال ہمیں ہوئی ہے۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے یہ معاملہ فقط خراسان ہی سے متعلق نہیں بلکہ دیگر علاقوں کی کیفیت بھی یہی ہے۔

یاد رہے کہ مظاہروں میں لوگ جو عمدہ نعرے بلند کرتے رہے ان میں ''استقلال'' آزادی اور اسلامی جمہوریہ، کا نعرہ بھی شامل تھا یعنی قوم چاہتی ہے کہ وہ آزاد و خودمختار ہو اور اپنا سیاسی طریقہ کار خود طے کرے۔ علمی منصوبوں کو اختیار کرنے میں آزاد ہو، اقتصادی مسائل پر خود غور و فکر کرے۔ مزید برآں قوم چاہتی ہے کہ وہ فکری، نظریاتی اور ثقافتی استقلال حاصل کرے یعنی اپنی خاطر خود ہی غور و فکر کرے اور خود ہی اپنی ثقافت کی تعمیر کرے۔

بے شک سامراج کی سب سے خطرناک قسم ثقافتی سامراج ہے۔ بنیادی طور پر کسی قوم کو مکمل سیاسی اور اقتصادی استعمار کے شکنجے میں کسنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ثقافتی اور فکری سامراج اس پر مسلط نہ کر دیا جائے۔ فرد کے استحصال کے لئے سب سے پہلے اس کے فکری تشخص کو سلب کرنا ضروری ہے تا کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے اسے بدگمان کر دیا جائے اس طرح اسے ہر چیز کا کہ جو کچھ بھی سامراج پیش کرے مشتاق بنا دیا جائے اور لوگوں میں جدت و جدیدیت کے نام پر ایسی صورت حال پیدا کر دی جائے کہ وہ اپنی روایات و امتیازات سے نفرت کرنے لگیں اور غیروں کی روایات و امتیازات کو خوش آمدید کہیں۔ اس کی خاطر انہیں ان کے ادب، فلسفے ان کی کتابوں اور علماء اور ان کے علمی و ثقافتی اعزاز و افتخار سے بیگانہ کرنا ضروری ہے۔ تا کہ ان کو غیروں کے ادب، فلسفے اور کتابوں

کے جادو میں گرفتار کر دیا جائے۔[1]

---

[1] ایک صاحب نقل کرتے ہیں کہ رضا خاں کے آخری دور میں ایک شخص نے جو اس وقت وزیر تعلیم تھا مگر بعد میں سینیٹر ہو گیا تھا ایک روز تہران یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے تقریر کی۔ اس کی تقریر کا حاصل رضا خاں کے دور حکومت میں تعلیمی وثقافتی ترقی کی تعریف وتوصیف تھا۔ اس نے طلبا سے کہا کہ تمہیں اس حکومت اور اپنے تمدن کی قدر کرنا چاہیۓ۔ تم اس یونیورسٹی کے مختلف شعبوں مثلاً ادبیات، سائنس اور میڈیکل وغیرہ میں پڑھتے ہو اور انشاء اللہ ان میں ماہر ہو جاؤ گے مگر کیا تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس پہلے کیا تھا؟ سابق ادوار کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے جادوگری اور رمل وغیرہ سے متعلق ایک خرافاتی کتاب نکالی اور از راہ تمسخر اس کے کچھ مندرجات پڑھنے شروع کر دیئے۔ میرا دوست بتاتا ہے کہ اتفاق سے انہی دنوں وزارت تعلیم نے ایک موضوع پر مقالہ نویسی کا مقابلہ رکھا تھا اور حسن اتفاق سے میرا مقالہ اس میں کامیاب رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق وزیر موصوف سے کامیاب مقالہ نگار کی حیثیت سے میری ملاقات بھی طے تھی۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو بہت متعجب ہوا کہ میں عالم دین کے لباس میں تھا۔ اس نے کہا کہ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ ایک مولوی بہترین مقالہ لکھ سکتا ہے۔ اس کے بعد پوچھا کہ تمہارے مقالے میں جو فلاں نکتہ موجود ہے وہ اطلاق نفسیات کے جدید ترین نظریئے کے مطابق ہے، میرا خیال تھا کہ مقالہ نگار امریکہ یا یورپ کا فارغ التحصیل ہے اب تم بتاؤ کہ تم نے یہ نکتہ کہاں سے لیا ہے؟ میں نے اسے بتایا کہ یہ مضمون ایک حدیث کا ہے پھر وہ حدیث اس کے سامنے پڑھی اس کے بعد میں نے ذرا عصبیت سے کہا کہ جناب وزیر آپ جو اس مقام پر تشریف فرما ہیں زیادہ فاضل ہیں یا میں؟ وہ خرافات کیا تھیں جو اس روز آپ نے یونیورسٹی میں طلبا کو سنائیں؟ کیوں آپ قوم سے خیانت کرتے ہیں؟ کیا جو کچھ ہمارے قدیم مدارس میں پڑھایا جاتا تھا وہ وہی تھا جو اس کتاب میں تحریر تھا؟ اگر ہمارے قدیم مدارس میں ادبیات نہیں پڑھائی جاتی تھیں تو آپ نے آج ادبیات کالج کی بنیاد کس چیز پر رکھی ہے؟ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ جو فقہ ان مدارس میں پڑھائی جاتی رہی ہے وہ دنیا کے بڑے بڑے مکاتب فکر کا مقابلہ کرتی ہے؟ یا وہ اصول جو وہاں پڑھائے گئے وہ مغربی قوموں کے نقطہ نظر سے ترقی یافتہ اور جدید علوم میں شامل ہیں اور آج مغربی فلسفہ ان کے انداز اختیار کر رہا ہے؟ ہمارے حوزہ علمیہ میں اشارات بوعلی سینا، اسفار ملا صدرا، منظومہ حاجی سبزداری کفایہ اخوند خراسانی، آثار شیخ مرتضی انصاری اور سینکڑوں صف اول کی علمی، فلسفی اور فقہی کتابیں زیر تدریس رہی ہیں۔ آپ ان سب کو دیکھے بغیر ہی ناآگاہ نوجوانوں کے اجتماع میں کہتے ہیں کہ حوزہ مٹھی بھر خرافات کی تدریس کرتا ہے کیا یہی شرافت وصداقت ہے۔؟

بہر حال یہ مسلم ہے کہ ایک زمانے سے ان کا یہ کردار رہا ہے کہ پہلے، ہمارے بچوں کو اپنی تعلیم سے بدگمان کریں اور ان کے ماضی سے ان کا تعلق توڑ کر مغرب سے جوڑیں۔

آج کی دنیا میں ہر ملک میں تمام علوم وفنون سے ایک ہی طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے اور کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتی کہ کسی خاص علم کا تعلق صرف اسی سے ہے لیکن زندگی کے بارے میں مختلف افکار ونظریات کے رویوں کے لحاظ سے علوم کی نوعیت میں فرق ہو جاتا ہے اس مقام پر قومیں ایک دوسرے سے جدا ہوجاتی ہیں۔ جوقوم اپنا ایک مستقل مکتب فکر رکھتی ہے اور فکر ورائے میں خودمختار ہوتی ہے وہ غیروں کے اصول ومبادی کے آگے سر نہیں جھکاتی اور اسی کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور جوقوم کوئی مستقل مکتب فکر نہیں رکھتی اور غیروں کے نظریئے ہی سے روشنی کے حصول میں کوشاں رہتی ہے وہ غیروں کی غلامی قبول کرنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ یہی وہ افسوسناک مصیبت ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے خود باختہ دانشور، خاصی تعداد میں موجود ہیں اور وہ دوطرح کے ہیں، ایک کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں آزاد ممالک کے مغربی افکار درآمد کرنا چاہئیں۔ یعنی لبرل ازم کے اور دوسرے کہتے ہیں کہ ہمیں کمیونسٹ بلاک کے نظریات وافکار کی خوشہ چینی کرنا چاہئے۔

گزشتہ سالوں میں ایک تیسرا گروہ بھی پیدا ہوگیا ہے جومخلوط افکار پر یقین رکھتا ہے یہ کچھ حصہ کمیونزم کا لیتا ہے اور اسے وجودیت..... (Eistentialism) کے کچھ افکار میں ملاتا ہے اور پھر اس ملغوبے کو اسلام کے چند افکار میں گھول دیتا ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہی اصلی اسلامی نظریہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اس موقع پر میں اس بات سے ضرور خبردار کروں گا کہ غیروں کے نظریات کی جانب جھکاؤ سے ہم اپنی نظریاتی خودمختاری کو قربان کرڈالیں گے۔ خواہ وہ نظریات کمیونزم کے ہوں یا وجودیت یا مخلوطیت کے۔ ان اسالیب کے ہوتے ہوئے اور ایسے طرز فکر کی موجودگی میں ہم ثقافتی استقلال اور خودمختاری حاصل نہیں کرسکیں گے اور آخر میں ہمارا ٹھکانا بس عدم اور فنا ہی ہوگا۔ یہ بہت بڑے خطرے کا اعلان ہے جو میں کررہا ہوں۔ اگر ہماری کوئی مستقل فکر نہ ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ہم مجبور تھے کہ اس گروہ یا دوسرے گروہ کے

ساتھ الحاق کریں مگر افسوس تو اس بات کا ہے ہم ان سے بہتر مستقل نظریئے کے مالک ہیں اور اغیار کے محتاج نہیں مگر یہ ہماری خود سے بیگانگی ہے جو ہمیں یہ سمجھاتی اور سجھاتی ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے اس سے دستبردار ہوجائیں اور غیروں کی دکان کا مال خریدیں۔

مثلاً ہم اپنے معاشرے میں متعدد بار مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک شخص جدلیاتی فکر سے انتہائی عشق رکھتا ہے جبکہ درحقیقت وہ خود بھی اس فکر کو اچھی طرح سمجھنے سے قاصر ہے بلکہ اس کے بارے میں کچھ باتیں ادھر ادھر سے اس کے کانوں میں پڑتی ہیں اور اس نے ذہن میں جاگزیں ہوگئی ہیں۔ مگر یہی شخص یہ کہنے کی جسارت بھی کرتا ہے کہ اسلامی فکر تو خود جدلیاتی فکر ہے یہ جانے بغیر کہ جدلیاتی فکر کا ہر اصول اس کے دین اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑتا اور اس کا خاتمہ کرتا ہے۔

ایک دوسرا شخص ایسا نظر آتا ہے جو یہ دیکھتا ہے کہ جدید فکری رو کا شعار ہے کہ ''اقتصادیات ہی ہر شے کی بنیاد ہے'' پس وہ بلاسوچے سمجھے اس بات کی طرف لپکتا ہے کہ اسلام کی بنیاد بھی صرف اقتصادیات ہی ہے اس نے یہ غور قطعاً نہیں کیا کہ یہ بات ان تمام روحانی واخلاقی بنیادوں کو ختم کردیتی ہے جن پر اسلام قائم ہے۔

ایک اور خود باختہ شخص آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ آج کل ملکیت کے خلاف جدوجہد کا دور دورہ ہے پس وہ اسلامی معیارات اور اقدار کو جانے بغیر کہتا ہے کہ نجی ملکیت قطعاً نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اسلام نجی ملکیت کا انکار کرتا ہے۔

مذکورہ مثالیں عرض کرنے سے میری مراد یہ نہیں کہ ان تمام معاملات کے پس پردہ بدنیتی ہی کارفرما ہے مگر جب کوئی ایسا عمل کرتا ہے جس کا نتیجہ خطرناک برآمد ہوتو یہ نتیجہ بدنیتی کے ہونے یا نہ ہونے پر موقوف نہیں ہوتا۔ اس حادثے کا تصور کیجئے کہ اگر کوئی انسان کسی عمارت میں پٹرول بہانے کے بعد ماچس کی تیلی جلائے اب خواہ یہ ماچس کی تیلی جلانا صرف سگرٹ سلگانے کی خاطر ہی ہو مگر حادثے کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ پس جب فضا آتش گیر گیسوں سے معمور ہو تو خواہ نیک نیتی سے ماچس کی تیلی جلائی جائے

بہر حال آگ بھڑک اٹھے گی۔ اور زبردست دھما کہ ہوگا۔

یہاں میں ''استقلال پر اگرچہ ہم نے طاغوتی نظام کا خاتمہ کر کے سیاسی واقتصادی استقلال حاصل کر لیا ہے لیکن ثقافتی استقلال حاصل کئے بغیر ہم شکست کھا جائیں گے اور اپنے انقلاب کو ثمر بار نہ کر سکیں گے۔

ہم پہ واجب ہے کہ ہم دنیا کو دکھا دیں کہ اسلام کا نظریہ کائنات (worldview) کسی مغربی یا مشرقی نظریہ کائنات سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ان دونوں کا پابند ہے یا محتاج ہے یہ کیا مرض ہے کہ اسلام کے نظریہ کائنات کی ہر غیر نظریئے کے ساتھ مطابقت تلاش کی جائے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب ان کے سامنے کوئی قرآنی آیات آتی ہے تو وہ مشرقی یا مغربی مکاتب فکر سے اس کی مطابقت کرنے کے لئے مختلف توضیحات وتاویلات کی سعیٔ نامشکور کرتے ہیں۔ جب یہ ''ملائکہ'' کا نام سنتے ہیں تو فوراً جستجو کرتے ہیں کہ کسی طریقے سے اس کی تفسیر وتاویل کریں۔ میں پوری صراحت سے یہ اعلان کرتا ہوں کہ یہ روش غلط ہے۔ اگر تم نے اب تک قرآنی مفاہیم کو نہیں سمجھا تو تمہیں چاہیے کہ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرو، تم چاہو یا نہ چاہو قرآن میں دسیوں معجزات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ مفاخر قرآن ہیں اگر یہ مسائل نہ رہیں تو دین میں سے آدھی رسالت مفقود ہو جائے۔ دین تو آیا ہی اس لئے ہے کہ ہمارے زاویہ نظر میں وسعت پیدا کرے، فقط حسی (مادی) امور کے لئے بعثت رسل کی ضرورت نہ تھی دین تو اس لئے آیا کہ وہ ہم میں ایمان بالغیب پیدا کرے۔ اور دین انسان کی اہمیت کو اس سطح تک بڑھانا چاہتا ہے کہ وہ روحانی واخلاقی قوانین سے بھی استفادہ کر سکے بلکہ یہاں تک کہ وہ ان کو مادی قوانین کے خلاف بھی کام میں لا سکے۔ جب ماورائے مادی قوانین، مادی قوانین میں دخل انداز ہوتے ہیں اور ان میں تغیر پیدا کرتے ہیں تو اس عمل کو ''معجزہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآن میں بہت سے معجزات ہیں اور بعض لوگوں کو ان سے شرم وخجالت محسوس ہونے لگتی ہے اور جب ان کی توجہ

قرآن میں مذکور کسی معجزے کی جانب دلائی جاتی ہے تو وہ اس کی تفسیر و تاویل شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کے لئے سمندر کا شق ہونا تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ اس وقت سمندر حالت ''جزر'' میں تھا اور جب فرعون غرق ہوا تو وہ حالت ''مد'' میں تھا۔ یا جب وہ ان آیات پر پہنچتے ہیں جن میں عصائے موسیٰؑ کا اژدہے کی صورت میں تبدیل ہو کر حرکت کرنا مذکور ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد قوم کے پروپیگنڈے کے اسلحے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوت بیان اور ان کا غلبہ منطق ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام کی فکر نے ان کی فکر کو اژدہے کی طرح نگل لیا۔ ایسی باتوں کا مطلب قرآن کا صریح انکار ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کسی فکری استقلال کے مالک نہیں نہ ہم نے قرآن کو اپنا رہنما بنایا ہے بلکہ یوں کہیے کہ ہم نے غیروں کے نظریات کو قبول کر لیا ہے اور انہی کی بنیاد پر آیات کی تفسیر و توضیح کرتے ہیں۔

جو لوگ اس طرح غور و خوض کرتے ہیں کہ نظریہ اسلام کو دیگر نظریات کے مطابق کریں یا ان نظریات سے کچھ عناصر کو اسلام میں گھسیڑیں، میں نصیحت کے طور پر ان لوگوں سے عرض کرتا ہوں کہ اس طرح (خواہ لاعلمی میں) وہ درحقیقت سامراج کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں اور ان کی یہ خدمت ان لوگوں کی خدمت سے زیادہ بڑی ہے جو سامراج کی صرف سیاسی یا اقتصادی خدمت کرتے ہیں۔ اسی تناسب سے ان کی قوم سے یہ خیانت بہت بڑی اور بدترین ہے۔

پس ہمیں مستقبل میں اسلامی انقلاب کے تحفظ کے لئے جن اہم بنیادی مسائل کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ان میں سے ایک فکر اور آئیڈیالوجی کے استقلال کا تحفظ ہے۔

انقلاب اسلامی میں روحانیت کا عنصر

آج رات میں چاہتا ہوں کہ انقلاب اسلامی کے تیسرے رکن یعنی روحانیت کے بارے میں گفتگو کروں۔ اگر آپ غور کریں تو اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ وہ انسانی معاشرہ جو کسی کی روحانیت نہ رکھتا ہو، زندہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ حتیٰ کہ مادی فکر رکھنے والے مکاتب کے پیروکار بھی جو کہ معاشرے اور اس کے تحرکات کی مادی تعبیر کرتے ہیں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ معاشرہ ایک قسم کی روحانیت و اخلاقیت کا محتاج ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ یہ روحانیت جو کہ سب کو تسلیم ہے حتیٰ کہ مادہ پرستوں کو بھی وہ روحانیت کیا ہے اور اس کے حصول کا راستہ کیا ہے؟ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ روحانیت جسے سب قبول کرتے ہوں ایک منفی مفہوم ہے۔ یعنی اس کا مطلب کچھ چیزوں کے ایک سلسلے کا نہ ہونا ہے۔ اگر انسانی معاشرہ اور اس کے افراد اس مقام پر جا پہنچیں کہ خود پرست، خودغرض اور مفاد پرست نہ ہوں اور نسلی، علاقائی اور مذہبی تعصب نہ رکھتے ہوں تو یہ سب ''نہ ہونا'' روحانیت میں شمار ہوتا ہے۔ روحانیت کے اس مفہوم کی بنیاد اگر یہ چیزیں نہ ہوں تو اس صورت میں انسانی معاشرے کے افراد برادرانہ طور پر ''ہم'' کی شکل میں زندگی بسر کریں گے اور ''میں'' بالکل ختم ہوجائے گی۔

یہاں ایک دلچسپ نکتہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس طرز فکر کے حامیوں سے ہم یہ سوال کریں کہ اس منفی روحانیت کو کس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ انسان خود اپنی ذات میں یہ خصوصیات نہیں رکھتا بلکہ (مارکس کی تعبیر کے مطابق) وہ ایک سماجی یا

معاشرتی وجود ہے۔ اگر پوچھا جائے کہ پھر خود پرستی، خودغرضی اور مفاد پرستی.....وغیرہ کہاں سے پیدا ہوتی ہے تو وہ کہیں گے کہ ان سب کی جڑ ''ملکیت'' میں ہے۔ انسان ابتدا میں ایک ''کل'' اور ایک وحدت میں زندگی گزارتا تھا۔ اپنے اور دوسروں کے درمیان کسی حد کا قائل نہ تھا، من وتو کا احساس نہ کرتا تھا مگر جب سے ملکیت کا مفہوم پیدا ہوا ''میں'' اور انانیت بھی پیدا ہوگئی۔ اگر ہم ملکیت کو درمیان سے نکال دیں تو روحانیت بھی.....جو کہ ہم نے بیان کی ہے.....کارفرما ہوجائے گی۔

ملکیت یعنی کہ اشیائے پیداوار اور ذرائع زندگی کا تعلق فرد سے ہو۔ جب لوگ کہیں میرا گھر، میری گاڑی، میری دکان، میرا سرمایہ.....ان اشیاء کا افراد سے تعلق ''میں'' کی شکل میں ان کو دوسروں سے جدا کردیتا ہے۔ جب یہ تعلق نہ رہے گا، جب ''میں'' کی جگہ ''ہم'' آجائے گا تو روحانیت بھی آجائے گی۔

اس طرح اس قسم کی روحانیت و اخلاق میں نہ تو کہیں خدا کا نام درمیان میں آتا ہے نہ غیب اور ماورائے طبیعت کا، نہ رسول، دین اور ایمان کا بس اخلاقی روحانیت یعنی یہ کہ ''میں'' اور انانیت ختم ہوجائے۔ نفوس ایک دوسرے سے متحد ہوں اور اتحاد و وحدت عمل میں آئے۔

اس نظریئے کے خلاف بھی ایک نظریہ موجود ہے جو کہتا ہے کہ اگر ہم ''میں'' کا مطلب اشیا کا فرد سے تعلق سمجھیں تو اس تعلق کی نفی اور ملکیت کی نفی ہر مقام پر ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ہم دولت کے معاملے میں اس نفی کا امکان پیدا کردیں اور یہ صورتحال ہوجائے کہ ''میرا گھر، میری گاڑی اور میری آمدنی' وغیرہ نہ رہے لیکن باقی معاملات میں ہم کیا کریں گے، ایک معاشرہ فطری طور پر مختلف مناصب ومراتب کا سلسلہ رکھتا ہے مثلاً پارٹی کو ایک رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں پارٹی کا رہنما یا صدر ایک ہی آدمی ہوگا دوسرے افراد اپنے مراتب و درجات کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ یا دولت کے معاملے میں مختلف مناصب ومشاغل ظاہر ہیں حتیٰ کہ سب سے کٹر اشتراکی معاشروں میں بھی بعض افراد مشہور و

معروف اور مقبول ہو کر سامنے آتے ہیں جبکہ دوسرے کئی افراد گوشہ گمنامی میں پڑے رہتے ہیں۔اس سے بھی اہم خاندانی مسائل کی منزل ہے کیا شوہر اور بیوی بھی اشتراک سے ہوں اور ''میری بیوی اور میرا شوہر'' سے ہمیں کوئی مطلب نہ ہو؟ یعنی مالی اشتراکیت جنسی اشتراکیت تک پہنچنا چاہئے؟ ہم جانتے ہیں کہ یہ قابل امکان نہیں ہے۔مختصراً اگر فرد سے اشیاء کا تعلق وہ ملکیت فرد کو فرد سے علیحدہ کرتی ہے اور اسے ''انانیت'' دیتی ہے تو بہر حال یہ تعلق ایک ایسا وجود رکھتا ہے جسے کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری جانب پہلے نقطہ نظر کے مخالف یہ کہتے ہیں کہ جو تعلق انسان کو بیگانگی پسند بناتا ہے اور روحانیت کو ان کی تعبیر کے مطابق اس سے جدا کر دیتا ہے وہ اشیا کا انسان سے تعلق نہیں بلکہ انسان کا اشیاء سے تعلق جوڑنا ہے، انسان کا اشیا سے وہ بندھن قائم کرنا جو ایک طرح کی دلی وابستگی اور تعلق ہے اسے دین کی زبان میں ''محبت دنیا'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اگر میں اس گھر سے وابستگی قائم کرلوں تو اس وقت میں دیگر انسانوں سے بیگانہ ہو جاؤں گا اور حقیقت میں بجائے اس کے کہ وہ میرا گھر ہو میں اس گھر کا ہو جاؤں گا۔یعنی میں اس گھر سے وابستہ ہوں نہ کہ گھر مجھ سے، یوں میں اس گھر کا غلام ہوں۔دوسرے لفظوں میں اس مرکب اضافی میں انسان اگر مضاف الیہ ہے تو علیحدہ اور تنہا نہیں ہوتا اور اگر مضاف بن جائے تو اپنے مضاف الیہ سے کم تر ہو جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔پس بجائے اس کے کہ ہم اشیاء سے فرد کی مالکیت کو چھین لیں ہمیں اشیاء سے انسان کی مملوکیت غلامی کو ختم کرنا چاہئے یعنی انسان کی داخلی اصلاح کی بجائے نہ کہ خارجی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طریقے سے اشیاء سے انسان کی مملوکیت کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ انسان کو اس حقیقت کا بندہ بنانے سے جو کہ اس کی فطرت کا جزو ہے، اس حقیقت کا جس نے اسے پیدا کیا ہے اور انسان اس سے ایک ذاتی ''عشق'' رکھتا ہے۔
بندگی جب خدا کی ہو تو وہ محض وابستگی نہیں ہوتی کیونکہ وابستگی

ایک محدود چیز سے ہوتی ہے اور انسان کو بھی محدود اور حقیر کر دیتی ہے
جبکہ ایک غیر محدود چیز سے وابستگی (بندھن) اور اس پر انحصار ہی
آزادی اور غیر محدودیت ہے۔

حافظ کہتا ہے:

خلاص حافظ از آن زلف تاب وار مباد
کہ بستگان کمند تو رستگار انند

حافظ اس زلف تابدار سے رہائی حاصل نہ کر کہ تیری کمند کے اسیر ہی تو آزاد ہیں۔

جو ہمارے عرفانی ادب سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عرفانی ادب میں روحانیت اشیاء کی مملوکیت سے انسان کے آزاد ہونے کو سمجھا جاتا ہے نہ کہ انسان کی مملوکیت سے اشیاء کی رہائی کو[1]

حافظ کہتا ہے:

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود
زہرچہ رنگ تعلق پذیر وآزاد است
مگر تعلق خاطر بہ ماہ رخساری
کہ خاطر از ہمہ عالم بہ مہر ارشاداست

میں اس شخص کی ہمت کا غلام ہوں جو اس نیلگوں آسمان کے نیچے جس رنگ سے بھی تعلق جوڑے اور آزاد ہے مگر تجھ سے مہ رخ سے دل کا تعلق جوڑنا اور ہے کہ دل تمام دنیا سے ہٹ کر اسی کی محبت میں خوش ہے۔

انسان کو آزاد کرنا چاہیے اور یہ کام اندر (روح) کی آزادی سے شروع ہونا چاہئے

---

[1] یاابن آدم خلقت الاشیاء لاجلك وخلقتك لاجلی (حدیث قدسی)۔
اے ابن آدم میں نے اشیا کو تیرے لیے خلق کیا ہے اور تجھے اپنے لئے خلق کیا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بیرونی بندھنوں پر اس قسم کی نگاہ رہے کہ یہ تعلقات خواہ کسی طرح کے بھی ہوں مگر باطن پر اثر انداز نہ ہوں۔[۱] اگر اشیا کا انسان سے تعلق پیدا ہوا اور اس کے بارے میں کوئی قانون اور ضابطہ نہ ہوا اور نہ ہی عدل کو مدنظر رکھا گیا ہو تو اندرونی تعلق ضرور متاثر ہوتا ہے۔ یہاں وہ آیت قرآن مجید جو کہ رسالت مآبؐ نے دیگر ممالک کے سربراہوں کے نام اپنے خطوط میں دعوت اسلام دیتے ہوئے درج فرمائی قابل غور وفکر ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ [۲]

کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ اس کلمہ حق کی جانب جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ سوائے اللہ کے ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک قرار دیں اور اللہ کے سوا کسی کو ربوبیت کی حیثیت سے تعظیم نہ دیں.....

عام طور پر دعوت اس طرح کی ہوتی ہے کہ کوئی کسی دوسرے کو اس سمت میں بلاتا ہے جس سمت میں خود ہوتا ہے۔ مثلاً دو قومیں ہیں ایک عرب اور ایک فارسی، اگر کبھی قوم عرب دعوت دے کہ اے ملت فارس آؤ ایک ہو جائیں تو اس سے مراد یہ ہوگی کہ آؤ ہماری زبان اختیار کرلو اور ہمارے رنگ میں رنگے جاؤ۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایک بات ہے جو کسی کا رنگ نہیں رکھتی نہ کسی ایک گروہ کا رنگ نہ کسی قوم کا نہ کسی نظریئے کا اور وہ کلمہ خدا ہے وہ خدا جو کہ ہمارا خالق ہے اور تمہارا بھی۔ اس کی رحمت تم پر بھی اسی طرح ہے جیسے ہم پر ہے۔ اس کا کرم بھی اسی طرح ہمارے شامل حال ہوتا ہے جس طرح تمہارے وہ قوانین کہ

---

[۱] البتہ ممکن ہے کہ کئی نادر افراد ایسے ہوں کہ وہ کسی بھی حال میں ہوں۔ مگر ان کے اندر پر اس کا اثر نہ پڑے لیکن یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔

[۲] سورۂ آل عمران: ۶۴

جن کی بنیاد پرتخلیق کا کاروبار چلتا ہے ہم پر اور تم پر یکساں لاگو ہوتے ہیں وہ کلمہ متساوی یہ ہے کہ آؤ اللہ کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں، آؤ ہم بھی اور تم بھی خود کو ہر قسم مملوکیت سے آزاد کرائیں۔ اور اس کے اطاعت گزاروں کے حلقے میں شامل ہو جائیں۔

کیا اسلام نے صرف اسی میزان پر قناعت کر لی ہے؟ یعنی آیا اسلام کے نقطہ نظر سے کافی ہے کہ فقط اندر کی اصلاح ہو اور دوسری بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ باہر خواہ کوئی صورت حال ہو؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اندر کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بلا فاصلہ باہر کی اصلاح بھی واضح ہے، کہ ہم انسانوں میں بعض دوسروں کو اب حاکم اور اپنے سے برتر قرار نہ دیں۔ ہمیں چاہیئے کہ انسانوں کے مالکیت و مملوکیت کے تعلقات کو جو کہ بہت سے دیگر غیر انسانی تعلقات پر منتہیٰ ہوتے ہیں ختم کر ڈالیں۔ یعنی قرآن کے نظریہ کے مطابق روحی، فکری، اخلاقی اور روحانی نظام کی ایک ہی اکائی میں خود کو درست کریں۔ اگر اجتماعی نظام اور بیرونی تعلقات میں بھی ایک ہی طرف توجہ ہوئی تو زیادہ کام نہیں ہوگا۔ قرآن نے اسی بارے میں فرمایا ہے:

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ ۝ أَنْ رَآهُ اسْتَغْنَىٰ ۝ [1]

انسان جب خود کو بے نیاز اور ہر شے کا مالک دیکھتا ہے تو یہ بات اس کے اندر پر اثر کرتی ہے اور اسے بھی بگاڑ دیتی ہے۔ دینی احکام میں کیوں ان سب چیزوں کی تاکید کی گئی ہے کہ سعادت مندترین زندگی یہ ہے کہ انسان کفایت رکھتا ہو اور کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو اور جو آمدنی شرافت مندانہ طریقے سے حاصل ہو وہ اس کے لئے کافی ہو؟ کیونکہ جس قدر مال و دولت اور نفع اندوزی کی خواہش مضبوط ہوتی ہے۔ اور جتنا انسان کے لئے وسیلہ آمدنی وہ شکل اختیار کر لے کہ اس کے بل بوتے پر خود کو بڑا اور نہایت اہم تصور کرنے لگے اسی قدر دوسرے اندرونی تعلقات اس طاقتور بیرونی عامل سے بچ کر اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور اس کے دباؤ سے ان میں بگاڑ پیدا ہوا ہے۔

---

[1] سورۂ العلق: ۶، ۷

اچھا! آغاز سخن کی طرف واپس چلیں، یہ دیکھیں کہ آیا اس کا امکان ہے کہ وہ اخلاقیات و روحانیت جسے آج اکثر مکاتب فکر کا شرف قبولیت حاصل ہے اور جسے ''ہیومنزم'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس گہرائی کو پیدا کئے بغیر ایجاد کی جا سکتی ہے جسے دین تجویز کرتا ہے؟ کیا ممکن ہے کہ انسان ایک ''اخلاقی وروحانی وجود'' یا ان لوگوں کی اصطلاح کے مطابق ''انسانیت پسند'' بن جائے بغیر اس کے کہ وہ نفس وآفاق (خود اور جہاں) کی معنوی تفسیر کر سکے۔ کیا روحانیت، خدا پر ایمان کے بغیر، مبداء ومعاد پر ایمان کے بغیر، معنویت انسان پر ایمان کے بغیر اور اس حال کے بغیر کہ اس پر غیر مادی پر تو حکم فرما اور اثر انداز ہو، بنیادی طور پر قابل امکان ہے؟ ان سب سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

ہمارے انقلاب کی جملہ خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ چونکہ یہ اسلامی آئیڈیالوجی پر استوار ہوا ہے۔ اس لئے ایک ایسی حقیقی روحانیت پر اپنا دارومدار رکھتا ہے کہ اس روحانیت پر جسے یہ حضرات تجویز کرتے ہیں جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کا بطلان اور شکست پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ ان ممالک میں جو کہ اس قسم کی روحانیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ملکیت کا وجود نہیں رکھتے، بے معنویتی، خودغرضی اور خود پرستی اس قدر رائج ہے جتنی کہ ان ممالک میں جو کہ ملکیت کے حامی ہیں۔ اس قسم کی 'ہیومنزم'' کے مکتب فکر میں پرورش پانے والوں میں سے ایک دلچسپ نمونہ اسٹالن کا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آیا اسٹالن کس دائرے اور کس معاشرے کا ہدایت یافتہ تھا؟ کیا اس معاشرے کا نہیں جس میں ان حضرات کے دعوے کے مطابق ملکیت کا وجود نہیں؟ اگر یہ تھیس نظریہ صحیح ہے کہ نجی ملکیت انسان کو خود پرستی، خودغرضی اور جاہ طلبی عطا کرتی ہے تو اسٹالن کے بارے میں کیا خیال ہے جبکہ اس کے نام نہ تو ملکیت کی کوئی دستاویز ہے نہ اس کی کوئی املاک ہے۔ نہ وہ متعدد گھروں اور اشیاء کا مالک ہے؟ کیسے ہوا کہ یہ شخص جو انہی کے مکتب فکر کا تربیت یافتہ ہے خود اپنے معتقدین کے اعتراف کے مطابق زمین پر سب سے زیادہ خودغرض اور درندہ صفات انسان شمار کیا جاتا ہے؟ آج کے کمیونسٹوں میں سوائے ایک خاص گروہ کے جو ''تودہ'' کے نام سے

مشہور ہے۔تمام گروہ اسٹالن کو ایک انسان نہیں سمجھتے اور اسٹالن ازم کو فاشزم کا مترادف سمجھتے ہیں۔ان معاشروں میں اسٹالن کی مثالیں کم نہیں اگر ایک بڑا اسٹالن پیدا نہ ہوا تو کیا ہزاروں چھوٹے اسٹالن وہاں مل سکتے ہیں اس طرح یہ بنیادی سوال باقی رہتا ہے کہ اگر روحانیت و اخلاقیت ملکیت کے جبراً انکار سے پیدا ہوسکتی ہے تو ان چھوٹے اسٹالنوں کے وجود کی کیا توجیہہ کی جاسکتی ہے۔

معنویت انسانی کے درد کو تنہا ملکیت کی نفی کافی نہیں ہوتی۔عدل اجتماعی لازمی ہے نہ کہ نفی ملکیت۔کیونکہ اگر ایک معاشرے میں عدل اجتماعی قائم نہ رہے تو پایہ روحانیت بھی متزلزل ہوجائے گا۔اسلام کی سوچ یہ ہے کہ روحانیت کو عدل وعدالت سے ملحق کر کے ایک دوسرے کے ساتھ معاشرے میں قائم کیا جائے۔جس معاشرے میں عدل کا وجود نہ ہو وہاں ہزاروں نفسیاتی مریض وجود میں آجاتے ہیں۔محرومیاں متعدد نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتی ہیں اور یہ نفسیاتی الجھنیں دھماکہ خیز ہوا کرتی ہیں۔یعنی اگر معاشرہ حضرت علی علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق دو گروہوں: بھوکے اور شکم سیر میں بٹ جائے تو بات یہی نہیں رہتی بلکہ سینکڑوں مفاسد اس کے پیچھے پیچھے چلے آتے ہیں ایک خود کو بڑا سمجھنے یعنی تکبر کی بیماری میں مبتلا ہوجائے گا اور دوسرا محرومیت سے پیدا ہونے والی بے چینی میں گرفتار۔

سخن درست بگویم نمی توانم دید
کہ مے خورند حریفان و من نظارہ کنم

صحیح بات بتاؤں کہ مجھ میں یہ دیکھنے کی تاب نہیں کہ دشمن تو عیش کریں (مے نوشی کریں) اور میں بس دیکھا کروں۔

ہمیں چاہئے کہ اپنے آئندہ معاشرے میں مسئلہ عدل کی اتنی شدت سے واضح کریں جتنی شدت سے مسئلہ روحانیت کو۔

افسوس تو یہ ہے کہ انسانی معاشروں میں عام طور پر ایک قسم کی انتہا پسندی پیدا ہو گئی ہے یعنی لوگ زیادہ تر دو حالتوں، افراط اور تفریط میں مبتلا ہوتے ہیں اور بہت کم میانہ

روی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔خود ہمارے معاشرے میں اگر ہم پچاس برس پہلے کی تقریروں اورتحریروں پر نگاہ ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ روحانیت واخلاقیت کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے مگر عدل کے بارے میں یا تو کچھ کہا ہی نہیں گیا یا بہت ہی کم کہا گیا ہے۔اب جو ایک تبدیلی پیدا ہوئی ہے تو عدل کی بات کی جاتی ہے مگر ایک یہ لہر بھی آ گئی ہے کہ روحانیت و اخلاقیت کی زیادہ بات نہ کی جائے گویا روحانیت کی بات کرنا انقلاب دشمنی ہے۔نہیں نہیں اسلامی انقلاب ایسا نہیں ہے۔اگر ہم نے روحانیت کو نظر انداز کر دیا تو ہم اپنے انقلاب کو ایک ایسے عامل سے محروم کر دیں گے جو اسے پیش رفت عطا کرنے والا ہے۔بعض اوقات نہایت افسوس سے یہ دیکھا گیا ہے کہ کچھ تحریروں میں اور بعض ان تفاسیر قرآن میں جو کہ آج کل لکھی جارہی ہے، روحانیت کا ایک مادی مفہوم پیش کیا جارہا ہے اور یوں اپنے طور پر اسلام کے لئے ایک انقلابی ثقافت مدون کی جارہی ہے۔قرآن میں بار بار آخرت اور قیامت کے الفاظ آئے ہیں اور ہر جگہ ان سے مراد بلاشک وشبہ یہی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا کا وجود ہے مگر گویا ان حضرات کی نظر میں قرآن میں جو دوسری دنیا کا نام آ گیا ہے وہ قرآن کی کمزوری ہے۔اس لئے جہاں بھی آخرت کا لفظ آئے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد انجام ہے ہر کام کا انجام، ہر جدوجہد کا انجام، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ قرآن کی بیان کردہ روحانیت کی بنیادی ڈھادیں۔افسوس یہ ہے کہ یہ تصرف کر کے عدل کے بارے میں غور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ روحانیت واخلاقیت کے بغیر عدل قابل امکان ہے حالانکہ ایک طرف تو قرآنی روحانیت کے لئے کسی توجیہہ وتفسیر کی ضرورت نہیں اور دوسری طرف روحانیت کے بارے میں فکر کئے بغیر عدل کا خیال کرنا بھی بے کار ہے۔قرآن کی نظر میں روحانیت مکمل کی بنیاد ہے یہ تمام عبادات جن پر کہ اسلام میں خاصا انحصار کیا گیا ہے انسان کی روح کے معنوی پہلو کی تقویت کے لئے ہیں۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالیے آپؐ کی ان تمام مصروفیات ومشکلات کے باوجود بھی جن میں کہ آپؐ گھرے رہتے تھے آپؐ کی حالت کے بارے میں قرآن بتایا ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ [1]

بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ دو تہائی رات تک عبادت کے لئے کھڑے رہتے ہیں اور کبھی آدھی رات تک اور کبھی تہائی رات تک اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ ہیں۔

اور کبھی اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاکید کرتا ہے:

''رات کا کچھ حصہ عبادت کے لئے اٹھیے، تہجد پڑھیے، نماز شب پڑھیے تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام محمود پر فائز ہوں۔'' الاسرا:۷۹

اور پھر حضرت علی علیہ السلام کی زندگی پر نظر ڈالیں اور ان کے عدل اجتماعی کو ہم دیکھیں، آپ کے کام کرنے، پسینہ بہانے اور سخت محنت کرنے کا مشاہدہ کریں اور اپنے ذہن میں راتوں کو خوف خدا سے آپؑ کے بیہوش ہو جانے کا بھی مشاہدہ کریں۔ یہ تاریخ اسلام کے حقائق ہیں اور وہ قرآن کی واضح آیات ہیں ان کی توجیہہ و تاویل کی ضرورت نہیں ان مسائل کی ہر قسم مادی تفسیر و تعبیر قرآن سے خیانت ہے۔ ہمارا انقلاب آئندہ دور میں اسلامی معیار کے مطابق عدل اجتماعی کے پہلو بہ پہلو اس روحانیت کا ضرورت مند ہے اور اس کو ساتھ رکھتا ہے اس روحانیت کو کہ جس کو رسول اللہؐ اور آئمہ علیہم السلام کے اسوہ میں ہم نے دیکھا ہے۔

---

[1] سورۂ المزمل:۲۰

انقلاب اسلامی اور علمائے دین

میرا خیال ہے کہ آج رات میں علمائے دین اور انقلاب اسلامی کے بارے میں گفتگو کروں۔ یہ مسئلہ دو جہتوں سے قابل بحث ہے۔ ایک تو ماضی سے مربوط ہے کہ اس انقلاب کے لئے علماء نے کیا اور کیسا کردار ادا کیا۔ حتیٰ کہ بعض حضرات کے قول کے مطابق علما اس قدر انقلابی ہو گئے کہ ایک انقلاب کو روبہ عمل لے آئے'' دوسرا انقلاب اسلامی کے مستقبل سے علماء کے تعلق کے بارے میں ہے۔

آج رات کی زیادہ تر گفتگو دوسری جہت پر ہو گی پہلی جہت کے بارے میں تو وہ متعدد گروہ جو اصطلاحاً بائیں بازو کہلاتے ہیں اور اپنے نظریات کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ نیز انہوں نے اپنے افکار کو اسلام کا لباس بھی پہنایا ہوا ہے اپنی تحریروں اور مطبوعات میں خود لکھتے ہیں کہ یہ قطعاً ممکن نہیں کہ علماء انقلابی بن جائیں کیونکہ مارکسزم کے اصولوں کی بنیاد پر (اور ان کا ایک گروہ اسی کو قرآنی اصول کہتا ہے) کہ انقلاب محروم طبقے کی جانب سے ان کی محرومیت کی بنیاد پر خوشحالی اور حکمران طبقے کے خلاف بپا کیا جاتا ہے اس لئے ان کا نظریہ ہے کہ علماء جو تاریخ کے تمام ادوار میں حکمران طبقے سے وابستہ رہے ہیں قطعاً انقلاب نہیں لا سکتے اور اگر آج ہمیں یہ نظر آ رہا ہے کہ انہوں نے انقلابی جذبہ پیدا کر لیا ہے تو یہ محض حکمران طبقے کا فریب ہے جس نے اپنے وجود کے تحفظ کے لئے علماء کے کان میں پھونک دیا ہے کہ اپنی صورت انقلابی بنا لو تا کہ وقت پڑنے پر انقلاب سے سمجھوتہ کیا جا سکے۔ اور یوں تم اپنا اور ہمارا تحفظ کر سکو حتیٰ کہ ''اسفند'' کی ۵٦ ویں اشاعت میں جو کہ ایک خفیہ گروہ کی طرف

سے شائع ہوتا تھا۔[1] میں نے خود پڑھا تھا کہ اس میں لوگوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ ان علماء کا فریب نہ کھایئے کیونکہ انہوں نے شاہ کی حکومت سے سمجھوتہ کر رکھا ہے اور یہ اسے تحفظ دینا چاہتے ہیں۔

جس سال رزم آرا قتل ہوا، بعض لوگ جو ہر معاملے کے بارے میں بدگمان رہا کرتے ہیں اس معاملے میں بھی پریشان تھے۔ رزم آراء کیونکہ میدان سیاست میں اپنے دور کا مرد آہن سمجھا جاتا تھا چنانچہ اس کے قتل کو بھی یہ لوگ بڑے تعجب سے دیکھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ہو نہ ہو یہ بھی رزم آرا کی کوئی چال ہے حتیٰ کہ اس کو گولی لگنے کے بارے میں بھی کہتے تھے کہ یہ بھی اس کا اپنا ہی پروگرام تھا۔ آج کے بعض دانشور بھی کچھ اسی قسم کی بدگمانیوں کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اگر کسی نے اس طرح کے دانشوروں کی مطبوعات کا مطالعہ کیا ہو تو اسے معلوم ہوگا کہ علماء اور اہل دین کے ہاتھوں انقلاب کی کامیابی نے ان کو زبردست حیرت زدہ کر دیا ہے جبکہ ان کے پیمانوں کے مطابق ایسا کوئی انقلاب ممکن ہی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ شروع میں تو بے چارے خوب مصروف رہے کہ اس کی کوئی تاویل کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ کہیں کہ وہ ''سب کام تو خود رزم آرا کا ہی ہے'' حالانکہ یہ حقیقت اتنی روشن تھی کہ تمام گروہوں حتیٰ کہ انتہائی بائیں بازو کے لوگوں کو بھی یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ہم علماء کی رہنمائی کو قبول کرتے ہیں۔ وہ خود سوچتے تھے کہ ہم جو بیسیوں سال سے انقلاب کا دم بھرتے رہے، پارٹی بناتے رہے اور پروگرام تشکیل دیتے رہے کیوں نہ ان سے پہلے کارنامہ سرانجام دے سکے۔ آخر ان مولویوں نے کیسے اتنی کم سامانی کے باوجود ایران کے اڑھائی ہزار سالہ نظام حکومت کی جڑیں اکھاڑ ڈالیں جبکہ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی مدبران کے ہاتھوں ایسے کارنامے کی پیشین گوئی نہیں کر سکتے تھے ایرانی ماہرین عمر

---

[1] ماہنامہ '' توفان ''جو ایران کے مزدوروں اور کسانوں کی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہے اس کے شمارہ نمبر ۱۵ میں دیکھئے '' نہ خدا، نہ بادشاہ اور نہ کوئی ہیرو ''کے عنوان کے تحت اور فرقان نامی ٹولے کی انقلاب کے دوران میں اور ماہ بہمن ۵۷ کی اشاعتوں میں اسی مفہوم کے مضامین موجود ہیں۔

انیات، ایرانی علماء کو سیاست و اقتصادیات کے لئے بس ایک ڈیکوریشن سمجھتے تھے اور ان کی کسی اہمیت کے قائل نہیں تھے۔ [۱]

آج کی محفل میں میرا ارادہ تحریک میں علماء کے کردار کو ثابت کرنے کا نہیں ہے یہ وہ رخ ہے جس کا اب کوئی منکر نہیں رہا۔ اس نشست میں زیادہ تر انقلاب کے مستقل اور اس کے تسلسل میں علماء کے کردار پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے اہم جو اس موضوع پر روشنی ڈالنے میں مدد دے سکتا ہے وہ ہے کہ آخر ایران کے علماء اتنی قوت کے مالک کیوں ہیں؟ اپنی ایک مختصر کتاب [۲] جو کچھ عرصہ قبل شائع ہوئی ہے، میں نے اہل تشیع اور اہل سنت علماء کا تقابل کیا ہے۔ باوجودیکہ علمائے اہلسنت کے ہاں اصلاحی امور پر علمائے شیعہ سے گفتگو ہوئی ہے اور بیشتر اصلاحی منصوبے بھی ان کی جانب سے بنائے گئے مگر پھر بھی کوئی گہری اصلاحی تحریک وجود میں نہیں لا سکے۔ اس کے برعکس علمائے شیعہ نے ان میدانوں میں بہت کم کہا اور لکھا ہے مگر اس پوری صدی میں انہوں نے ایسی تحریکوں کی رہبری کی ہے

---

[۱] ایک بے دین ادیب ڈاکٹر انور کامہ ای جو کئی سال قبل تودہ پارٹی کی نظریاتی کونسل کا رکن تھا بعد از اں اس کے خیالات میں اس قدر تبدیلی آئی کہ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک رسالے ("نگین" کا ۷ ۵ کا دوسرا شمارہ) میں مضمون لکھا جس میں ایران کی موجودہ تحریک کا نسبتاً غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا گیا۔ مقالہ نگار نے اس تحریک کا تحریکِ مشروطیت اور تیل کو قومیانے کی تحریک سے تقابل کیا اور بتایا ہے کہ سابقہ دونوں تحریکوں کی ناکامی کی ذمہ داری، سیکولروں پر عائد ہوتی ہے یعنی ان پر کہ جن کے ہاں سیاست مذہب میں سے نہیں پھوٹتی اور جو مذہبی رجحانات کو قطعاً اہمیت نہیں دیتے۔ ان دونوں تحریکوں کی ابتدا میں مذہب اور سیکولر دونوں قوتیں باہم مل کر گامزن ہوئیں مگر فائدہ اٹھانے کے موقع پر سیکولروں نے سوچا کہ مذہب والوں کو پیچھے دھکیل دیا جائے اور یہی امر ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بنا موجودہ انقلاب کے سلسلے میں بھی اکثر دانشوروں کا یہی خیال تھا کہ معاشرے میں دو ہی فیصلہ کن قوتیں موجود ہیں ایک اقتصادی اور دوسری سیاسی۔ کسی کو بھی یہ خیال نہیں تھا کہ معاشرے کے بطن میں ایک اور قوت بھی موجود ہے جو دوسری تمام قوتوں سے زیادہ طاقتور ہے اور زیادہ گہری جڑیں رکھتی ہے اور وہی بالآخر انقلاب کو کامیابی کی منزل پر پہنچا سکتی ہے۔

[۲] چودہویں صدی میں اسلامی تحریکیں از استاد مرتضیٰ شہید مطہری (مترجم)

جن کی نظیر اہل سنت کے ہاں بھی نہیں ملتی کجا کہ مسیحی یا دیگر مذاہب کے علماء میں۔

ایک امریکی، حامد الگار، جو کہ مسلمان ہو گیا ہے، نے ایک کتاب ''ایران میں تحریک مشروطیت کے دوران رہبر علماء کا کردار'' کے نام سے تحریر کی ہے۔ اس کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ البتہ اس کتاب میں تاریخی واقعات کا آغاز قاچاریوں کے ابتدائی عہد سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بخوبی یہ واضح کیا گیا ہے کہ شیعہ قاچاریوں کے پورے اڑھائی سو سالہ دور میں مسلسل سلاطین سے نبرد آزما رہے اور ان کے مخالف تحریکوں کی رہبری کرتے رہے۔ باوجود اس کتاب کے کچھ مقامات ضعیف بھی رہ گئے ہیں اور یہ ایران کے ماحول سے مکمل آشنائی نہ ہونے کی دلیل ہیں۔ بہر حال بحیثیت مجموعی یہ ایک غیر جانبدارانہ تحریر ہے اور اس نکتے کو بخوبی آشکار کرتی ہے کہ علمائے شیعہ ہمیشہ عوام کے ساتھ رہے اور ان کے مفادات کے لئے تحریکیں چلاتے رہے۔ یہی تیل کو قومیانے کی تحریک جسے ہم سب نے دیکھا ہے کہ علماء نے مرحوم آیت اللہ خوانصاری اور آیت اللہ کاشانی کی رہبری میں اور ''فدائیانِ اسلام'' کے دوش بدوش کیسا عظیم کردار ادا کیا۔ اگر ان کی آواز میں قدرت و طاقت نہ ہوتی تو محال تھا کہ ایرانی تیل قومیایا جاتا۔ یہ علماء کی ہی واحد قوت تھی جو سب سے آگے تھی اور اس طرح برسر کار تھی کہ فساد کی جڑ کو بنیاد سے اکھاڑ سکی۔

یہ باتیں تو سب ماضی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہمارے لئے کافی نہیں کہ ہم بس انقلاب کے ماضی کی ہی باتیں کر کے خوش ہوتے رہیں کہ علماء نے یوں یا اور دوں کیا۔ جو گزر گیا سو گزر گیا اب ہمیں مستقبل کی فکر کرنا چاہئے۔ آئندہ انقلاب کو علماء کی زیادہ ضرورت ہے بشرطیکہ علماء اپنے فرائض کو سمجھ کر اپنی ذمہ دریوں سے عہدہ برآ ہوں۔ علماء کو اپنی کوشش دگنی کر دینی چاہئے انہیں اپنا ابلاغ بھی دگنا کر دینا چاہئے۔ ہمارے انقلاب کے آغاز کی مثال آغاز اسلام کے دور جیسی ہے۔ ہمیں حکمران قوموں کو کچل دینا چاہئے، یہ دور مبازرت و جہاد کا دور ہے۔

صدر اسلام میں امام حسین علیہ السلام کے زمانے تک حاکم کے اقتدار کے خلاف

مقابلہ آمنے سامنے ہوتا رہا مگر پہلی صدی کے آخر اور خاص کر دوسری اور تیسری صدی میں جو کہ باقی آئمہ کا دور ہے دنیائے اسلام میں خاصی افراتفری پیدا ہو چکی تھی۔ مختلف اقوام کے اسلام کی طرف مائل ہونے اور دنیوی سلطنت کے وسیع ہونے کے بعد مسلمانوں نے شمشیر بند ہونا کم کر دیا اور اس کی بجائے کتابوں نے نئے اسلحے کے طور پر کام آنا شروع کر دیا۔ تمام اسلامی سرزمین کے عوام زور وشور سے چاہنے لگے کہ وہ نئے دین کی آسمانی کتاب کو پڑھیں اور سمجھیں۔ نو وارد مسلمانوں کو قرآن فہمی کی محبت سابق مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی اور ہر جگہ لوگ اس شخص کے پیچھے ہو لیتے جو قرآن پڑھنا جانتا اور انہیں پڑھا سکتا قرآن کی یہ قدر منزلت مفسرین ومحدثین کے لئے رونقِ بازار ثابت ہوئی خصوصاً جبکہ تفسیر کی بنیاد بھی حدیث سے استفادہ پر ہی رکھی گئی تھی اس مقبولیت اور التفات نے ''حدیث سازی'' کی گمراہ کن تحریک کو جنم دیا۔ ظاہر ہے کہ جب کسی مال کی طلب زیادہ ہو مگر رسد اتنی نہ ہو تو جعلی مال کی گنجائش پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ خدا رحمت فرمائے آیت اللہ بروجردی طاب ثراہ پر، یہ نکتہ آپ کی یادگار ہے آپ فرماتے تھے کہ اس زمانے میں حالات کچھ ایسے تھے کہ اگر کوئی شخص مدینے سے نکل کر خراسان جیسے دور دراز علاقے کا سفر کرتا اور وہاں کے لوگ پوچھتے کہ یہ کون ہے تو بتایا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی ہے اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی ہے بس ایک دو جملے کافی ہوتے کہ ہزاروں لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس سے حدیث سنانے کا مطالبہ کرتے جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لب ہائے مبارک سے سنی ہو۔ تو یہ ''صحابہ'' تھے جو نہ تو مسلسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے تھے بلکہ بہت سے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک کے آخری برس میں مسلمان ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بس چند ایک حدیثیں اور دو ایک واقعات ہی جانتے تھے۔ لوگوں کا ہجوم اور قبولیت عامہ ان لوگوں کو جو ضعیف الایمان ہوتے تھے کچھ کچھ حدیث گھڑ لینے پر اکسا دیتی تھی اور یوں گرم بازاری سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے تھے [1]

---

[1] البتہ یہ امر تجربۃً ثابت نہیں کہ انکی اس ظاہر یا خفیہ دست اندازی کا مقصد اسلام کو نابود کرنا تھا۔

اس انحرافی تحریک کے علاوہ دیگر فکری تحریکیں بھی پیدا ہوئیں۔ان میں ایک یہ ہے کہ جن اقوام پر اسلام اثر انداز ہوا ان میں ایسے لوگ موجود تھے جو اس اثر اندازی کے خلاف اپنے مذاہب کے دفاع کے لئے اُٹھے۔اس زمانے کی آزادیٔ افکار و خیالات کی بناء پر مختلف قسم کے مسائل جو سراسر اسلامی افکار کے خلاف تھے سامنے آئے [1] اس سلسلے کا ایک نمونہ حضرت مفضل رحمۃ اللہ علیہ کی داستان میں ہے جو کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے صحابی تھے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے دور میں وہی کام سرانجام دیتے تھے یعنی اپنے زمان و مکان کے حالات کو مدنظر رکھ کر کارِ رسالت اور وظیفہ شرعی کی انجام دہی۔امام حسین علیہ السلام کے دور کے حالات میں اسلام کا اصل مسئلہ یزید اور اس کا گروہ تھا مگر امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے کے قوت کے اقتدار سے مقابلے کے علاوہ منحرف اور گمراہ مکاتبِ فکر سے بھی مقابلہ درپیش تھا۔حاکم وقت سے مقابلے میں اگر چہ امام نے عملی طور پر شرکت کی اور علوی تحریکوں کی بھرپور تائید کی جو کہ خلوص نیت سے چلائی گئی تھیں۔واضح رہے کہ انقلاب کے ساتھ ساتھ آزادی بھی آتی ہے اور آزادی اپنے ہمراہ افکار و نظریات کے تضادات اور فلسفیانہ اور کلامی بحثیں بھی لاتی ہے۔اس موقع پر تلوار کام نہیں دیتی بلکہ درس کتاب اور قلم ہی مناسب اسلحہ ثابت ہوتے ہیں۔

ان گونا گوں افکار سے لے کر جو مختلف کلامی فقہی اور فلسفی فرقوں سے پیدا ہوئے مذاہب یہود، مجوس، کیتھولک، دہری اور مادی مکاتب فکر تک کے سامنے امام جعفر صادق علیہ السلام کا فریضہ کیا تھا؟ امام کا فریضہ یہ تھا کہ وہ اس محاذ پر مقابلے کے لئے اٹھیں اور امت کو صحیح فکر اور درست راستے کی رہنمائی فرمائیں۔امام رضا علیہ السلام کے دور میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام والے حالات تھے اس وقت مامون جو خود بھی دانشور تھا مختلف فرقوں اور مذاہب کے رہنماؤں اور علمی شخصیتوں کے اجلاس طلب کرتا تھا جہاں انھیں ایک دوسرے سے مناظرے اور مباحثے کی دعوت دیتا تھا۔ان اجلاسوں میں امام رضا علیہ السلام کے خطبات نور بار اور دین آموز ہیں۔

---

[1] ان میں بہت سے افکار آج کل کے افکار سے ملتے جلتے تھے۔

جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اس نکتے کی توضیح کے لئے تھا کہ بعض اوقات اگر حالاتِ زمانہ ایسے ہوں کہ حق کی باطل سے پہچان کرنا مشکل ہو جائے تو رہبر دینی حسین علیہ السلام، امام صادق علیہ السلام یا امام رضا علیہ السلام کے زمانے میں ہوتے تو بے شک اسی طرح عمل کرتے جس طرح ان دونوں بزرگوں نے کیا تھا۔

علماء کے لئے واجب ہے کہ وہ ہمارے انقلاب کے لئے اور آئندہ درپیش افکار کے لئے بھی جو ابھی سے نظر آرہے ہیں خود کو پہلے سے دس گنا زیادہ تیار کریں۔ علماء کو قوت حاصل کرنے، پروگرام تشکیل دینے اور منظم ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ علماء کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے۔ علماء کو چاہیے کہ جلد از جلد چارہ گری کی فکر کریں ایسا نہ ہو کہ جب یہ عظیم سیلاب بے قابو ہو جائے تو وہ تیاری شروع کریں۔ خوش قسمتی سے تہران میں ایسے کئی ادارے وجود میں آچکے ہیں۔ میری مراد علماء کی کونسل وغیرہ سے ہے جو تشکیل پا چکی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے ادارے پورے ایران میں قائم ہو جائیں تا کہ تمام علماء ایک دوسرے سے متصل و مربوط ہو جائیں اور یوں خود کو زیادہ بہتر طریقے سے تیار کر سکیں۔

مساجد علماء کے لئے بہترین پایگاہ (BASE) شمار ہوتی ہیں۔ مساجد کے حالات پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انقلاب کے بعد بہت سی مساجد خالی ہو گئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انقلاب کی کامیابی سے پہلے مساجد بہترین طریقے پر اپنا انقلابی کردار ادا کر رہی تھیں اور وہ مسائل پیش کئے جاتے تھے جن کی عوام کو ضرورت تھی۔ مگر انقلاب کی کامیابی کے بعد مساجد کو اس تبدیلی سے ہم آہنگ نہیں کر سکیں۔ اب مسجد کو زندگی دینے کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ مسجد کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی مذہبی پروگرام ترتیب دے۔ حزبِ اسلامی اور سیاسی و مذہبی رہنمائی کے ادارے بھی وجود میں آنے چاہئیں تا کہ ان اداروں کے ذریعے عوام کی سیاسی تربیت کی جائے۔ اس سانحہ کی راہ روکنے کا طریقہ یہ نہیں کہ ان اداروں کو ہی وجود میں آنے

سے روک دیا جائے بلکہ مساجد کو اپنے حالات پر تجدید نظر کرنی چاہیے، اس سلسلے میں اصل کردار اور زیادہ بوجھ علماء کے کاندھوں پر ہے۔ انقلاب کو اپنی منزل پر پہنچنے اور کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنے کے لئے علماء کے دوش پر رہنا چاہیئے۔ اگر اس کی علمبرداری علماء کے ہاتھوں سے لے کر روشن فکروں کو سونپ دی گئی تو ایک صدی سے کم میں یا ایک نسل گزرتے ہی اسلام بالکل مسخ ہو جائے گا۔ کیونکہ اصل ثقافت اسلامی کے آخر یہی علماء ذمہ دار ہیں۔ اس لئے علماء کی کیفیت کو بھی بعینہٖ رکھنے پر اصرار کرنا بھی ان کو ختم کر دے گا۔ میں دس سال سے یہ بات دہرا رہا ہوں کہ علماء ایک آفت زدہ درخت کی مانند ہیں ان کی اس آفت کا علاج کرنا چاہیئے لیکن اگر کسی کا خیال ہے کہ اس کا علاج نہ کیا جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا یہ آفتیں اور امراض درخت کو ختم کر ڈالیں گی۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ اس درخت کو جڑ ہی سے اکھاڑ دیا جائے تو اسے شدید غلط فہمی ہے کہ کوئی اور درخت اس کی جگہ پر کھڑا ہو سکے گا تاکہ نئے سرے سے اس کی جگہ کوئی اور پودا اگایا جائے۔ اس لئے انقلاب اسلامی کے مستقبل کا علماء کے مستقبل سے بہت تعلق ہے۔

آغاز بیان میں میں نے ایک سوال پیش کیا تھا اب اس کا جواب عرض کرتا ہوں کہ تمام تر تاریخ میں شیعہ ہی بڑی بڑی تحریکیں چلانے پر قادر رہے ہیں اس بات کے دو اچھے اسباب ہیں۔

پہلا سبب شیعہ علماء کی ثقافت کا ایک خاص انداز ہے۔ شیعہ ثقافت خود ایک زندہ، حرکت بخش، اور انقلاب آفرین ثقافت ہے۔ یہ وہ ثقافت ہے جو علی علیہ السلام کی سیرت اور ان کے افکار سے غذا حاصل کرتی ہے۔ یہ وہ ثقافت ہے جو اپنی تاریخ کے دامن میں عاشورا رکھتی ہے اور صحیفۂ سجادیہ اور امامت وعصمت کا اڑھائی سوسالہ دور رکھتی ہے۔ دیگر ثقافتیں ایسے حرکت بخش عناصر کی حامل نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ شیعہ علماء کا ادارہ آئمہ علیہم السلام کے ذریعے قائم کیا گیا اور اپنے قیام کے آغاز سے ہی یہ حکومت کے اقتدار سے اختلاف رکھتا ہے۔ حامد الگار کی اسی کتاب میں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا تھا اس کے قول کے

مطابق ''شیعہ علماء روحانی لحاظ سے خدا پر انحصار رکھتے ہیں اور معاشرتی لحاظ سے عوام پر اور کبھی بھی جزوِ حکومت نہیں رہے''۔ مگر اس کے برعکس علماء اہلسنت شروع ہی سے حکومت سے وابستہ رہے ہیں۔ اسی زمانے سے جب ہارون نے ابو یوسف کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز کیا اور اسی دوران مفتیٔ اعظم کا عہدہ بھی انہی کے ہاتھ میں رہا، ظاہر ہے کہ عوام کے اندر ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔ ہمارے آج کے دور میں خود شیخ محمد عبدہ جیسے شخص جو مصر کے دانشور علماء میں سے تھے اس وقت اہمیت کے قابل سمجھے جاتے ہیں جب حاکمِ مصر خدیو عباس ان کا مفتی اعظم کے حیثیت سے تقرر کرے مگر مصر کے عوام نے ان کے مفتی اعظم ہونے کو بے اہمیت سمجھا۔ یا شیخ محمد شلتوت جیسے مصر کے بہت بڑے مصلح جن کی تقرری کا حکم جمال عبدالناصر کا ہے تو جب وہ اپنے کمرے میں بیٹھتے ہیں ان کے بالائے سر جمال عبدالناصر کا فوٹو ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ شخص عوام میں اپنا مقام نہیں بنا سکتے اور نہ ہی حکمران اقتدار کے خلاف کبھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن شیعہ علماء نے شروع سے ہی اہل اقتدار سے بے نیازی برتی اور سلاطین و حکام ہمیشہ مجبور ہی رہے کہ ان کی آستان بوسی کریں اور کی دہلیز پر جبہ سائی کریں[1]

شیعہ علماء کا تحریکوں کی رہبری پر قادر ہونے کا دوسرا سبب ان کی خودمختاری و آزادی اور یہ حقیقت ہے کہ وہ کبھی کسی حکومت کے اندر یا باہر کی کسی قوت کے حلقہ بگوش نہیں رہے، نہ اس سے احکامات وصول کئے اور نہ ہی اسے اپنے گھر کا راستہ دیا۔ مستقبل میں بھی

---

[1] جس زمانے میں میں قم میں تھا وہ مرحوم آیت اللہ بروجردی طاب ثراہ کی مرجعیت کا ابتدائی دور تھا۔ ایک روز تہران کے ایک معروف دیندار تاجر نے اموالِ شرعی کی ایک بڑی رقم ڈرافٹ کی شکل میں جو ایک چھوٹے سے کاغذ پر تحریر تھیں۔ ایک شخص کے ذریعہ قم بھیج کر آقا کی خدمت میں پہنچائی۔ کاغذ کا وہ پرزہ آیت اللہ کو دیا گیا۔ آپ نے اسے ایک طرف رکھ دیا اور فرمایا ہمارے لئے اس طرح مزید رقم نہ بھیجنا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ ہم پر احسان کر رہے ہو حالانکہ علماء اس بات سے زیادہ شریف و محترم اور عزیز ہیں کہ یوں ان کی توہین کی جائے۔ یہ بھی تو ایک شیعہ رہبر ہی ہے جو اس حد تک بے نیازی کا پتہ دیتا ہے بعد ازاں وہ تاجر معذرت کے لئے قم آیا اور اس قدر التماس وزاری کی کہ اس کی معذرت قبول ہوئی

ہمیں علماء کے ان امتیازات کو محفوظ رکھنا ہے۔ امام خمینی نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ وہ اس بات کے حامی نہیں کہ علماء حکومتی مناصب قبول کریں حتیٰ کہ اسلامی جمہوریہ میں بھی، مگر بعض کام علماء کی صلاحیتوں سے مخصوص ہیں۔ مثلاً معلمی اور قضاوت.... مگر علماء کو حکومتی کام قبول نہیں کرنا چاہئیں، وہ حکومت سے ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوں اور اسے ہدایات دیں، انہیں حکومت کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا چاہیئے۔ شاید نگرانی کے کاموں کا ایک معقول طریقہ وہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ادارے کو قائم کرنا ہے جو حکومت سے آزاد رہ کر کام کرے۔ علماء کو مساجد کے تحفظ کے لئے بھی کوشاں ہونا چاہیئے تا کہ نماز با جماعت کی امامت محفوظ رہے، مجالس وعزاداری محفوظ ہے مگر ضروری ہے کہ اصلاح ہو اور تحریف، جعلسازی اور جھوٹ سے ان کو پاک رکھا جائے آخری بات یہی ہے کہ علماء انقلاب کے تسلسل اور تحفظ کے لئے ایک بنیادی کردار کے ذمہ دار ہیں۔ انہیں پوری طرح یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے شائستہ مقام کا تحفظ کریں اور عوام کی تحریکوں کی اگی صف میں اسی طرح انکی ہدایت کے کام جاری رکھیں۔

